

# نگار

| جلد ۲۷ | فہرست مضامین مئی ۱۹۳۵ء               | شمار ۵                     |
|--------|--------------------------------------|----------------------------|
| ۲      | ملاحظات                              |                            |
| ۹      | پارسی اہل کتاب ہیں                   | سید وجاہت حسین ام۔ اے۔     |
| ۲۲     | دیرو حرم کے قصے                      | پنڈت کشن پرشاد کول         |
| ۳۳     | مصطفیٰ کمال اور ترکی کا انقلاب حکومت |                            |
| ۴۱     | باب الانتقاد (کار امروز)             |                            |
| ۵۵     | مکتوبات نیاز                         |                            |
| ۵۹     | لکھنؤ کی داستان گوئی                 | خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی |
| ۶۳     | آخری فیصلہ۔ !                        | مرزا سرفراز علی حیدر آبادی |
| ۶۶     | مطبوعات موصولہ                       |                            |
| ۷۰     | باب المراسلۃ والمناظرہ               |                            |
| ۷۴     | باب الاستفسار                        |                            |
| ۷۸     | منظومات                              | روش۔ بنی احمد۔ انجم۔ نگار  |



# نگار

اڈیسٹر: — نیاز فتحپوری

|        |           |       |
|--------|-----------|-------|
| جلد ۲۷ | مئی ۱۹۳۵ء | شمارہ |
|--------|-----------|-------|

## ملاحظات

(بہ سلسلہ مادہ گزشتہ)

### تعمیم اور ہماری موجودہ تعلیم

ہندوستان کی تعلیمی فضا کیا ہے اور تعلیم نے یہاں کے ذہن و دماغ میں کیا اُمید افزا انقلاب پیدا کیا ہے؟ اس کے سمجھنے کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ مختلف لوگوں سے سوال کیجئے کہ ”تعلیم یافتہ“ سے مراد اُن کی کیا ہے؟ یعنی جیب زدہ ایک شخص کو ”تعلیم یافتہ“ کہتے ہیں تو اُن کے دماغ میں کیا تاثرات ہوتے ہیں۔

ملاحظہ! آپ کو ہر جماعت اور ہر طبقہ سے اس کا جواب یہی ملیگا کہ ”تعلیم یافتہ“ سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی کالج سے کوئی ڈگری حاصل کی ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جس نے انگریزی زبان حاصل کی ہے اور اسی زبان میں چند مخصوص علوم و فنون کی تعلیم پائی ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات اس میں مذہبی درسگاہوں کے فارغ التحصیل لوگوں



کو بھی شامل کر لیں، لیکن خیر، ہمیں اس وقت اُن سے بحث نہیں ہے کیونکہ جہاں سرے سے کوئی توقع ہی نہ کی جائے وہاں شکوہ و شکایت کا کیا محل ہے۔ الغرض تعلیم کا جو مفہوم عام طور پر ذہن نشین ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ ایک شخص معمولی انگریزی لکھ پڑھ سکے اور جس میں اتنی اہلیت موجود ہے وہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہنے اور کہلا سکتے جاسکتے کا مستحق قرار دیتا ہے۔ پھر کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ عوام نے ”تعلیم یافتہ“ ہونے کا مفہوم کیوں متعین کیا ہے اور اس مفہوم میں انھوں نے ذہنی و اخلاقی ترقی و اصلاح کو کیوں شامل نہیں کیا؟ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام کے ماتحت ہم نے کوئی ذہنی و اخلاقی ترقی کی ہی نہیں کہ ہم اس کے علاوہ کچھ اور سمجھنے کا موقعہ لوگوں کو دیتے۔ انھوں نے ہم کو جیسا دیکھا ویسا ہی سمجھا اور جو سمجھا وہی کہا۔ ممکن ہے آپ اس کو عوام کی سادگی و بے شعوری سے تعبیر کریں، لیکن میرے نزدیک پبلک کا یہ اتنا زبردست طنز ہے کہ اگر ہم میں کچھ بھی احساس ہو تو ہم کو اپنی ذات سے شرم آنے لگے کیونکہ اس معنی کے ساتھ کسی کو ”تعلیم یافتہ“ کہنا گویا اس کو گالی دینا ہے۔

آئیے غور کریں کہ ایک جاہل شخص اور ایک تعلیم یافتہ انسان میں (خواہ وہ انگریزی کالج کا گریجویٹ ہو یا دیوبند کا فاضل) کیا فرق ہے؟ ایک جاہل شخص یقیناً کتابی علم سے محروم ہے اور اسے نہیں معلوم کہ آفتاب کے گرد زمین گردش کرتی ہے یا نہیں اور اس گردش سے شب و روز یا فصل و موسم کیوں ظہور میں آتے ہیں، وہ بلا شک یہ بھی نہیں جانتا کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر کب حملہ کیا تھا اور خاندان مغلیہ کے کتنے بادشاہوں نے کس کس وقت یہاں حکومت کی، یہ بھی درست ہے کہ وہ ہوا اور پانی کے اجزائے ترکیبی سے ناواقف ہے، وہ یقیناً اس سے آگاہ نہیں کہ فرانس و امریکہ کا انقلاب کیوں ہوا اور اس کا اثر وہاں کی قوموں پر کیا ہوا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ وضع و پوشش کے حسن اور معیشت و معاشرت کے تکلف و تصنع سے بے خبر ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کالج کے وہ فارغ التحصیل طلبہ جو طبیعیات و فلکیات کے ماہر ہیں، جو تاریخ عالم میں کافی درجہ بصیرت رکھتے ہیں، جو ریاضیات کی مشگافیوں سے واقف ہیں اور جو کتابوں اور اخباروں کے ذریعہ سے تمام مسائل حاضرہ کا علم رکھتے ہیں، بلحاظ نتیجہ جاہلوں سے کیا امتیاز رکھتے ہیں؟ اگر تعلیم جدید کا نتیجہ صرف یہ قرار دیا جائے کہ اسکی وساطت سے نگرانی کے حصول میں کچھ آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور قوم کے چند افراد کو تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کی جگہاں مل جاتی ہیں، تو بیشک ہر تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری موجودہ تعلیم ہمارے لئے مفید ثابت ہوئی، لیکن اگر تعلیم کا حقیقی مقصد قوم کے نظام تمدن و معاشرت کو بلند و استوار کرنا ہے اور افراد میں ایسا ذہنی ارتقاء پیدا کرنا ہے جو ہیئت اجتماعی کے لئے مفید ہو، تو انسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم بجائے مفید ہونیکے اور



زیادہ مضرت رساں ثابت ہوئی، کیونکہ اگر ملک کی ساری آبادی جاہل رہتی تو کم از کم اس سے یہ فائدہ تو ہوتا کہ سب ایک سطح پر قائم رہتے اور فرق مراتب کا احساس بلندی دستی کا امتیاز پیدا نہ کر سکتا، لیکن اب یہ حالت ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص غیر تعلیم یافتہ انسان کو غیر مہذب و ناشایستہ سمجھ کر اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا اور اس کے وجود کو زمین کے لئے ہار سمجھتا ہے۔

تعلیم ہو یا کوئی اور چیز، تمدن انسان کی تمدنی دنیا میں اس کے فائدے کے ہمیشہ دو پہلو ہوا کرتے ہیں، ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی، یعنی ایک یہ کہ ہر فرد علیحدہ علیحدہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے اور دوسرا یہ کہ تمام افراد ملکر بحیثیت مجموعی قوم یا جماعت کے لئے مفید ثابت ہوں۔ پھر غور کیجئے کہ موجودہ تعلیم ان دونوں پہلوؤں کے لحاظ سے کس حد تک قابل قدر ہے۔ جس حد تک صرف انفرادی مفاد کا تعلق ہے، اس کا حال اس وقت کسی سے مخفی نہیں کہ اگر تعلیم کے ادنیٰ ترین مقصد (یعنی حصول دولت و زر) کو سامنے رکھا جائے تو اس میں بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی، چاہے جابجاء اجتماعی و قومی ترقی یا ذہنی و اخلاقی ارتقاء اس کا تو کوسوں پتہ نہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا طریق تعلیم نہایت خراب ہے اور جو نصاب تعلیم مقرر کیا جاتا ہے اس میں ملکی ضروریات یا قومی داعیات و مصالح کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

پہلے جب صرف مکتبی تعلیم کا رواج تھا تو کم از کم ایک مقصد تو سامنے ہوتا تھا اور وہ یہ کہ بچہ کو مذہبی انسان بنایا جائے۔ ہر چند یہ مقصد کوئی بلند مقصد نہ تھا اور نہ تمام نوع انسانی کے مفاد پر حاوی تھا، لیکن خیر ایک محدود جماعتی تنظیم تو اس سے متعلق ہو سکتی تھی، لیکن اب تو موجودہ تعلیم کی وجہ سے مرکزیت بھی باقی نہیں رہی اور سوائے اس ایک غرض کے کہ پڑھ لکھ کر نوکری مل جائے گی (جو حد درجہ خود غرضانہ و ذلیل ذہنیت ہے) اور کوئی سماجی یا ملکی تعلق اس سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

طلبہ کتابیں پڑھتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کو چند سوالات کا جواب دیکر سند فراغ حاصل کرنا ہے اور کبھی ان کے دل و دماغ میں یہ امنگ پیدا نہیں ہوتی کہ وہ علم کو محض علم کے لئے حاصل کریں اور اس سے دوسروں کو فائدہ پہونچا کر نظام تمدن میں اپنی ہستی کو کارآمد ثابت کریں۔ وہ ٹیکسیپر کے ڈرامے پڑھتے ہیں محض اس مجبوری سے کہ وہ نصاب میں داخل ہیں اور کبھی ان کو یہ دلولہ نہیں پیدا ہوتا کہ وہ خود بھی ٹیکسیپر کی طرح اپنی زبان میں ایسا ہی کوئی کارنامہ چھوڑ جائیں، وہ سائنس و ریاضی کے مسائل کا علم حاصل کرتے ہیں، اس انداز سے گویا پتھر کوئی مصیبت نازل ہوئی ہے اور کبھی ان میں یہ دلولہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی ان علوم کی مدد سے عالم ایجاد و اختراع میں



وہی مرتبہ حاصل کریں جو اہل مغرب کو حاصل ہے، وہ اکبر بادشاہ کی سارے سوانح حیات پڑھ جائیں گے لیکن ان میں کبھی وہ جذبہ رواداری پیدا نہ ہوگا جو اکبر میں پایا جاتا تھا، وہ انقلاب فرانس کی مکمل تاریخ حفظ کریں گے لیکن خود انقلاب پیدا کرنے کی ذہنیت کبھی ان میں نشوونما نہ پائے گی۔ الغرض وہ پڑھتے تو سب کچھ ہیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے جوں کے توں جاہل بنے رہتے ہیں اور اسی لئے جب کالج سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو وہ خود اپنی مدد کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتے دوسروں کو فائدہ پہنچانا کیسا؟

جیسا کہ میں نے ماہ گزشتہ کے ملاحظات میں ظاہر کیا تھا، نوع انسانی تین مختلف طبقوں میں منقسم ہے، سب سے بڑا طبقہ وہ ہے جسے ہم مزارعین اور محنت و مزدوری کرنے والوں کا طبقہ کہتے ہیں، دوسرا متوسط الحال لوگوں کا اور تیسرا امراء یا سرمایہ داروں کا۔ اس لئے اگر تعلیم کا مقصد یہ قرار پائے کہ وہ معیشت و معاشرت کے لحاظ سے ادنیٰ طبقہ کے انسان کو اعلیٰ طبقہ تک پہنچا دے تو میں اس کو گمراہی سے تعبیر کروں گا، کیونکہ اس طرح ادنیٰ طبقہ کے تو اکثر افراد طبقہ اوسط میں شامل ہو جائیں گے لیکن طبقہ اوسط کے بہت کم افراد طبقہ اعلیٰ تک پہنچ سکیں گے اور لامحالہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کی قوت مزدور طبقہ کی کمی سے اور زیادہ بڑھ جائے گی اور متوسط الحال طبقہ جو بہ حالت موجودہ کم پریشان نہیں ہے مزدور جماعت کے شمول سے اور زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو جائیگا۔ میں اس کا قائل نہیں کہ سرمایہ داری کسی وقت دنیا سے بالکل فنا ہو جائے گی، کیونکہ اگر نگاہ غائر سے دیکھا جائے تو بالشوینزم بھی (جو سرمایہ داری کی سخت دشمن سمجھی جاتی ہے اور جو اشتراکیت کی انتہائی صورتوں کو برو کار لانے والی یقین کی جاتی ہے) حقیقتاً سرمایہ داری کو محو نہیں کر سکی، اور فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ پہلے اگر وہ انفرادی حیثیت رکھتی تھی تو اب اس نے اجتماعی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ ذہنیت تو مٹ سکتی ہے، لیکن سرمایہ داری کی اہمیت کبھی محو نہیں ہو سکتی۔

پھر اگر ہندوستان کی موجودہ حکومت اور اس کے سیاسیات کو دیکھتے ہوئے اس امر کا امکان ہوتا کہ یہاں کی موجودہ سرمایہ دارانہ ذہنیت دور ہو سکتی ہے تو ہمارا فرض ہوتا کہ سب سے پہلے طبقہ اعلیٰ کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی موجودہ ذہنیت کو بدلنے کی کوشش کی جائے، لیکن چونکہ اس کا امکان نہیں ہے، اس لئے جس حد تک تعلیم کا تعلق ہے اس جماعت کی طرف ہم کو توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ رہ گئے باقی دو طبقے سو بیک وقت ان دونوں جماعتوں میں عام تعلیم کرنے کی سخت ضرورت ہے، لیکن یہ بالکل اصولی غلطی ہوگی



اگر ان دونوں کی تعلیم یکساں یا ایک ہی مقصد کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔  
ہم کبھی اس کی توقع نہیں کر سکتے کہ ہندوستان کے تمام گاؤں کسی وقت شہروں میں تبدیل ہو جائیں گے یا  
کہ گاؤں کے رہنے والے سب کے سب شہر میں آکر زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ اس لئے گاؤں کی آبادی اور اس کے  
داعیات اور شہر کی آبادی اور اس کے ضروریات میں فرق کو ضروری ہوگا۔

گاؤں کا بچہ سب سے پہلے جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے وہ زراعت کا ماحول ہے اور اس لئے اس سے ہٹ کر اسکی  
تعلیم کا پروگرام متعین کرنا بالکل اصول کے خلاف ہوگا۔ البتہ وہ ابتدائی صنعتیں جو زراعت سے تعلق رکھتی ہیں بیشک  
اس میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اسوقت جو صورت تعلیم کی دیہات میں رائج ہے وہ اس کی اگر بالکل ضد نہیں ہے تو  
اس کے موافق بھی نہیں ہے۔ ان کے لئے تاریخ و جغرافیہ، ریاضی و مساحت کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی فن  
زراعت اور اس کے متعلقات کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

زمین کی قسمیں اور ہر زمین کے لحاظ سے اس کی پیداوار کے امکانات، آلات زراعت اور ان کا استعمال،  
آبیاری اور اس کے مختلف طریقے، کھاد اور اس کی قسمیں، ذراعتی جانوروں کی پرورش و حفاظت، دودھ اور کھن  
کی پیداوار، سردار درختوں کے باغ طیار کرنا یہ تمام وہ باتیں ہیں جن کی تعلیم نہ صرف کتابی صورت میں بلکہ عملی طور پر ضروری ہو  
اور اسی کے ساتھ نجاری و آہنگری جو آلات زراعت طیار کرنے میں مدد دیکے، سوت کا تنا، کپڑا بنانا، شکر بنانا، تیل نکالنا،  
صابن بنانا اور خیاطی یہ وہ صنعتیں ہیں جن کی عملی تعلیم دیہات میں ہونا چاہئے۔

اس وقت ہندوستان کی آبادی میں دس کروڑ ۳۳ لاکھ زراعت پیشہ ہیں اور صرف ایک کروڑ ۵۴ لاکھ وہ ہیں  
جو صنعت و حرفت پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ دیہات کی تعلیم کا مسئلہ ایسا ہے جو ہندوستان  
کی ۶۷ فی صدی آبادی سے تعلق رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک ہم اس جزو غالب کی اصلاح نہ کریں ملک کی  
فلاح و ترقی کا خیال دل میں لانا ہی فعل عجت ہے۔

ریاستوں کو چھوڑ کر اسوقت ہندوستان میں تقریباً ۶۷ کروڑ ایکڑ زمین قابل زراعت موجود ہے، لیکن کاشت ہوتی  
ہے صرف تقریباً ۲۳ کروڑ ایکڑ میں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ طبقہ مزارعین تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بالکل نادان  
ہے کہ وہ زمین سے کیا کیا کام لے سکتا ہے اور وہ کونسی تدابیر ہیں جو اسکی قوت عمل کو بڑھا کر تمام افرادہ زمین سے  
فائدہ حاصل کرنے کا اہل اسکو بنا سکتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دیہی تعلیم بہت پھیل گئی ہے، لیکن قطع نظر اس سے کہ جو تعلیم وہاں



ہوتی ہے مفید بھی ہے یا نہیں، اس کی کثرت اشاعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں ۱۶۸۳۵ مدارس ابتدائی پائے جاتے ہیں، جن میں شہری اور دیہی طلبہ کی مجموعی تعداد ۷۴ لاکھ سے زائد نہیں ہے اور اسی طرح وڈیہ مدارس ثانوی میں (جن کی تعداد صرف ۵۸۹۴ ہے) کل ۵۲۵۲۱ طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اسی کے ساتھ اس نسبت کو بھی دیکھئے جو گاؤں اور شہر کے طلبہ میں پائی جاتی ہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندوستان کے طبقہ مزارعین کی ۶۷ فی صدی آبادی میں ایک فی ہزار بھی ایسا نہیں ہے جس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہو یا یوں سمجھئے کہ مشکل سے فی گاؤں دو تین آدمی پڑھے لکھے نظر آئیں گے۔ پس ظاہر ہے کہ جس ملک کے تعلیمی انحطاط کا یہ عالم ہو وہاں فلاح و ترقی کا کیا ذکر ہے۔

الفرض سب سے پہلے دیہات میں تعلیم کے رواج دینے کی ضرورت ہے اور تعلیم بھی وہ جو دیہی زندگی و دیہی مشاغل کے لحاظ سے مناسب و ضروری ہے۔ لیکن اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکومت اور قوم دونوں ملکر اس طرف توجہ نہ کریں۔

حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مخصوص قوانین کے ذریعہ سے کاشتکار کے ایسے حقوق متعین کرے جو اسے زمین سے محبت کرنا سکھادیں اور زمینداروں کی جبر و تعدی اس کے اندر غلامانہ ذہنیت نہ پیدا ہونے دے، علاوہ اس کے محکمہ صنعت و زراعت اور کوآپریٹو بینک کو بھی محکمہ تعلیم کا ساتھ دینا چاہئے تاکہ کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ کاشت اور دیگر دیہی صنعتوں کے تجربات بھی اُن کے ذہن نشین کئے جائیں انکی تعلیم کے لئے ہر ضلع میں ایک بورڈ الگ ہونا چاہئے جو حکومت و قوم دونوں کا نمائندہ ہو اور سال میں ایک بار نمائش کے ذریعہ سے دیہات کی آبادی کو بتایا جائے کہ ایک ہی ضلع کے مختلف دیہات نے زراعت و صناعات زرعی میں کیا کیا اور کتنی ترقیاں کیں، اصول حفظانِ صحت کی طرف بھی خاص توجہ کرنا چاہئے اور ہر گاؤں میں لکھروں اور متحرک تصویروں کے ذریعہ سے اس کی اہمیت کو واضح کرنا چاہئے۔ اس بورڈ کا فرض یہ بھی ہوگا کہ دیہات کے وہ لڑکے جو اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم کے لئے موزون ہیں اُن کو وظائف دیگر شہر میں بھیج دے جہاں اسی مخصوص فن کی تکمیل کریں جس کی طرف ان کا فطری رجحان ہے۔

رہائی شہروں میں متوسط الحال طبقہ کی تعلیم اور موجودہ ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا مقررہ نصاب و طریق تعلیم و تربیت، سو اسکی ناکامی خود اس کے لغو و مہمل ہونے کی دلیل ہے۔ خیر اُن طلبہ کا تو ذکر ہی فضول ہے جنہوں نے صرف میٹرک تک تعلیم پائی ہے کہ اُن میں تو معمولی نوشت و خواندگی کی اہلیت بھی پیدا نہیں ہوتی



اور عملی زندگی میں وہ کسی قسم کا حصہ لینے کا شعور نہیں رکھتے، کالجوں کے گریجویٹ طلبہ بھی ذہنی و دماغی تربیت کے لحاظ سے کوئی ذمہ دارانہ کام انجام نہیں دے سکتے اور اپنی معلومات عامہ و واقفیت فنون کے اعتبار سے وہ حد درجہ ناقص ہوتے ہیں۔

اس سے قبل چونکہ دفاتر وغیرہ میں ان لوگوں کو ملازمت مل جاتی تھی اس لئے اس نقص کو زیادہ محسوس نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب کہ عام بے روزگاری کی وجہ سے بقاء حیات کے لئے بہت زیادہ جہد و مقاومت کی ضرورت ہے، تعلیم کے اس نقص کا احساس زیادہ ہوتا جا رہا ہے اور لوگوں کو اس مسئلہ پر غور کرنا پڑ رہا ہے۔ تعلیم کے انتہائی مقصد صرف دو ہو سکتے ہیں، ایک درست اخلاق اور دوسرا اقتصادی فائزگی البالی۔ میں اقتصادی اصلاح کو زیادہ ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ ہماری بہت سی بد اخلاقیات پریشاں روزگاری سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی تدبیر صرف یہی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں صنعت و حرفت کی تعلیم کو لازم قرار دیا جائے۔ میٹرک کلاس اور بی۔ اے دونوں کو توڑ دینا چاہئے۔ ابتدائی درجہ تکمیل کا انٹر میڈیٹ تک رکھا جائے اور آخری درجہ ام۔ اے کا۔ اسکول میں پہلے ہی درجہ سے آہستہ آہستہ کنٹرکٹنگ اور اصول پرچوں کو مختلف صنعتوں اور مختلف اداروں کے استعمال سے آگاہ کیا جائے، یہاں تک کہ دسویں درجہ کے بعد وہ کسی خاص صنعت کی تکمیل کے اہل ہو سکیں، اور اس کے بعد پورے دو سال میں وہ تجارت حاصل کر لیں۔ پھر اگر کسی کو تحقیقات و ریسرچ کا شوق ہو تو وہ مزید تین سال کے بعد تکمیل کا آخری درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

اس وقت جو نصاب رائج ہے اس میں سے بعض چیزیں حذف کر دینا چاہئے اور بعض کو کم کر دینا چاہئے مثلاً فلسفہ کہ اس کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں ہے یا تاریخ و جغرافیہ کی بڑی بڑی کتابیں کہ صرف انکا ملخص کافی ہے، اسی طرح ریاضی کا معیار بھی گھٹا دینا چاہئے اور بلند تعلیم صرف ان طلبہ کو دینا چاہئے جو انجینیری وغیرہ سیکھنا چاہیں اسی طرح طبیعیات و کیمیا کی تکمیل بھی صرف ان کے لئے ضروری قرار دی جائے جو ڈاکٹری سیکھنے کی طرف راغب ہوں۔ ڈرائنگ بھی صرف ان طلبہ کو سکھانا چاہئے جن کو آئندہ پبلک رفاقت و مصور بننا ہے۔ وہ طلبہ جو صرف ادب و انشا کے شائق ہیں ان کو نہ صرف انگریزی، بلکہ عربی، فارسی، اردو اور ہندی سکھانا بھی لازم ہے۔ الغرض تعلیم و نصاب تعلیم میں اتنا تنوع پیدا کرنا چاہئے کہ ہر طالب علم اپنے مخصوص ذوق کے لحاظ سے کوئی لائن اختیار کر سکے اور غیر ضروری کتب ابوں میں اس کا وقت ضائع نہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو تو کیونکر ہو؟

ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی!



# پارسی اہل کتاب ہیں

(سلسل)

## حضرت زرتشت اور انکی تعلیمات

اب ہمیں دین زرتشت کی مخصوص کتب مقدسہ کو دیکھ کر معلوم کرنا چاہئے کہ اس مذہب کے معتقدات اصول دین کیا ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے یسنا کے اُس حصہ میں جو گاتھا زبان میں ہے حضرت زرتشت کے وہ تمام اقوال و کلمات مرقوم ہیں جو حضرت زرتشت نے تبلیغ دین کے وقت اپنی زبان مبارک سے نکالے تھے۔ یسنا کے تیسویں باب میں وہ اپنے خطبہ کو اس اعلان سے شروع کرتے ہیں کہ:۔ ”ہر آدمی کا فرض ہے کہ اپنے اچھے اور بُرے کی تمیز میں اپنی عقل کو استعمال کرے۔ چونکہ یہ وقت نہایت اہم ہے لہذا لوگوں کو چاہئے کہ اپنے لئے ایک اچھا مذہب چُن لیں۔ اور خداوند عالم کے احکام کو بغور سنیں۔“

پھر وہ فرماتے ہیں کہ:۔ ”ہر شخص کے لئے اس دُنیا میں صرف دو راستے کھلے ہیں اور یہ دو راستے نیکی و بدی کے ہیں۔ نیکی کا راستہ نجات و مسرت ابدی کی طرف لیجاتا ہے اور بدی کا راستہ جہنم کی طرف لیجاتا ہے اور ہمیشہ کیلئے مصائب و تکالیف میں مبتلا رکھتا ہے۔ پس خدا نے ہر شخص کو عقل کا مادہ عطا فرمایا ہے تاکہ وہ تباہ و برباد نہ ہو جائے۔“

زرتشت نے نیکی و بدی کے دو متضاد کوالٹن کے متعلق جو الفاظ کہے ہیں اُن کا ترجمہ ڈاکٹر جمیس مولٹن نے اس طرح کیا ہے:۔

- (۱) عقلمندوں کو چاہئے کہ خداوند عالم کی حمد و ثنا کریں اور سچائی اختیار کریں۔ اس کے عوض وہ رحمت پائیں گے۔
- (۲) اپنے کان اچھے کلام کے سننے میں استعمال کرو۔ دروغ و کذب میں دور اندیشی سے کام لیکر امتیاز کرو۔



(۳) رفتار گشتار اور کردار میں اچھائی اور بُرائی دونوں پائی جاتی ہیں۔ دانا وہ ہے جو ان دو دیرینہ ازواج میں نیکی کو اختیار کرتا ہے اور نادان وہ ہے جو بُرائی کو۔

(۴) جب یہ دور وہیں شروع میں ایک دوسرے سے ملیں تو انھوں نے زندگی اور موت کو پیدا کیا۔ دنیا کے اختتام پر دروغ پرستوں کو بدترین زندگی نصیب ہوگی اور راستی پسند بہترین جگہ پائیں گے۔

(۵) ان دور وحوں میں دروغ پرست نے بدترین کردار کو پند کیا اور راستی کے پیرو نے حق کو اپنا پیر بنایا۔

(۶) یقیناً جھوٹا مسرت سے محروم رہیگا اور وہ لوگ جنہوں نے سچائی کی پیروی کی ہے انھیں حسب وعدہ انعام ملیگا۔

(۷) پس لے لو گو اگر تم ان احکام پر جو ”مزدا“ نے تمہارے لئے مقدر کئے ہیں غور کرو گے اور اس دنیا کے رنج و راحت کا خیال رکھتے ہوئے دروغ پرستوں کے دائمی رنج اور سچوں کے نیک انجام کو پیش نظر رکھو گے تو اس دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ شاد و خرم رہو گے۔

جیسا کہ خطبہ سے ظاہر ہے یہ خطبہ اس مجمع کے سامنے دیا گیا تھا جہاں ہر طبقہ اور نزدیک و دور مقامات کے لوگ جمع تھے۔ ان مخصوص باب کے متعلق راگزین لکھتے ہیں۔ ”یہ وعظ دین زرتشت کے عہد اولین میں وہی مرتبہ رکھتا ہے جو مذہب عیسائیت میں ”موعظت کوہ“ کو حاصل ہے۔“

یہ مسئلہ خیر و شر بالکل ویسا ہی ہے جیسا قرآن اور انجیل میں ہے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کتب مقدسہ میں بھی لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلیں اور اُس راستے پر ہرگز نہ چلیں جس کی طرف شیطان لیجاتا ہے۔ اللہ کے محبوب بندوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عقل کو کام میں لائیں تاکہ حق و ناحق (یعنی صواب و خطا) روشن و تاریکی، نیکی و بدی، خدا اور شیطان میں تمیز کر سکیں۔ ہلوگوں کے سامنے اس دنیا میں یہی دوراں ہیں۔ ایک طرف سب ہا راستہ ہے جو خدا اور آرام گاہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور دوسری طرف غلط راستہ ہے جہاں شیطان کی رہنمائی میں جہنم اور آلام ابدی میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

شر یعنی بدی کے مخلوق خداوندی ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر ”میکولوچ“ لکھتے ہیں: ”وہ شخص جو کسی الہامی کتاب کو پڑھنے اور اُس پر یقین رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ ”بدی“ خدا کے قبضہ سے باہر ہے یا بدی کو خدا نے خلق نہیں کیا۔ ہمیں اس خیال پر مجبور ہیں کہ بدی کو ایک ایسی مستقل مخلوق خدا سمجھیں جو خدا کی مشیت کا مل



کے قبضہ میں ہے۔ ہمیں اس عقیدہ کے آخر میں اور نامعلوم نتائج کے متعلق کچھ چون و چرا کی گنجائش نہیں۔  
علامہ سر محمد اقبال اپنی ایک تصنیف میں گیلگرا اور ہاگ کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یہ کہنا کہ صداقت و کذب کی دو روحوں کا ذات واجب الوجود میں یکجا ہو جانا یہ مطلب رکھتا ہے کہ بدی خدا کے وجود کا ایک جزو ہے اور نیکی و بدی میں کشمکش ہونا گویا خود خدا کا بدی سے جنگ کرنا ہے۔“

اس بحث کے سلسلہ میں شمس العلماء شبلی نعمانی کے خیالات یہ ہیں کہ: ”تمام گناہ جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں وہ حقیقت امر یہ ہے کہ خود خداوند عالم کی مرضی سے سرزد ہوتے ہیں مگر اس حقیقت کے اقرار میں عوام کو شبہ ہوگا کہ ان کا بانی و باعث خود خدا ہے پس ہم اب اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خیر و شر خداوند عالم کی مخلوق ہے۔ اور یہ دونوں آخر کار اُسی واجب الوجود میں مل جاتے ہیں، کیا قرآن حکیم نے شیطان کے انسانی امن و امان میں مغل ہونے کی شکایت نہیں کی ہے؟ کیا خدا سے دانا و بینا کو خود اپنی خلق کی ہوئی شے یعنی بانی شر کی آئندہ شرارتوں کا حال معلوم نہ تھا۔ بہر حال یہ سب امور اسرار خداوندی اور خلقت عالم میں ہیں۔“

فطرت میں اجتماع ضدین ہر جگہ پایا جاتا ہے ہم روشنی کی محض تاریکی کی بدولت تمیز کرتے ہیں۔ گرمی کا احساس سردی کی بنا پر کرتے ہیں، محبت کا مزہ نفرت کی تلخی سے پہچانتے ہیں اور صحت و تندرستی کی نعمت کا اندازہ بیماری کی تکلیف جھیلنے کے بعد ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے ہر شے کا جوڑا پیدا کیا ہے کوئی شخص کسی شے کے حسن کا احساس اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک اُس کے خلاف بُرے نتائج سے اُسے مطلع نہ کر دیا جائے۔ حکم خداوندی کے مطابق پاکبازی راستی اور مذہب کے شاندار نتائج کی تشریح اُس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک شیطان کے برباد کن رویہ سے لوگوں کو مطلع نہ کر دیا جائے اور یہ امر بوضاحت نہ بتایا جائے کہ شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے فلاں فلاں آلام و مصائب میں گرفتار ہونا پڑتا ہے کامیابی کا اندازہ ناکامی سے ہوتا ہے۔ لیکن خدا نے رحمان و رحیم اپنے پیارے بندے کے کسی ایسے کام کا جو ناکامی یا بُرے نتائج کا باعث ہوں ذمہ دار نہیں اُس نے ہر شخص کو کافی عقل عطا فرمائی ہے اور اُسے اس دارالمحن میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ پس جو شخص اُس کے حکم کو دل و جان سے سنتا اور اُس پر عمل کرتا ہے وہ نجات ابدی حاصل کرتا ہے اور اس کے برخلاف جو اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرتا اور غلط راہ اختیار کرتا ہے تباہ و برباد ہوتا ہے۔



زرتشت کی غرض بھی یہی تھی کہ وہ فطرت کے دونوں رُخ کو مشرق کے اُن باشندوں کو سمجھا دے جو جہالت کے باعث نفسانی خواہشات کے غلام ہو رہے تھے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہ خیال ایرانیوں کے لئے بالکل نیا تھا اور اسی لئے زرتشت نے اپنے سامعین کی ذہنیت کا لحاظ کرتے ہوئے یوں بیان کیا کہ: ”اصل میں دور وحیں تھیں جن میں سے ایک نیکی اور دوسری بدی تھی دونوں آپس میں ملکر اس طرح کام کرتی رہیں کہ اُنکا علیحدہ کرنا بالکل ایسا ہی دشوار تھا جیسا دن اور رات کا۔ جو شخص نیکی روح کی پیروی کرتا ہے اُسے چاہئے کہ بد روح سے غافل در رہے کیونکہ بدی ہر وقت اُسے راہ غلط کی طرف گمراہ کرنے کے لئے مستعد رہتی ہے۔ یہ دور وحیں ایک دوسرے کی مخالفت میں برابر برسر پیکار ہیں اور ان کی کشمکش تار و ز قیامت جاری رہے گی اور اس وقت خدا نیکی کی مدد کرے گا۔ ہر شخص ان دور وحوں سے ایک کو اپنا رہبر بناتا ہے۔ وہ شخص جو نیکی کو رہبر بناتا ہے وہ یزدان کا معین و مددگار سمجھا جاتا ہے اور وہ شخص جو بدی کو اپنا سردار تسلیم کر لیتا ہے اُس کا اہرمن کی فوج میں شمار ہوتا ہے پس جس نے یزدان کی مدد کی وہ جنت پائے گا اور جس نے اہرمن کی اطاعت کی وہ جہنم میں جھونک دیا جائیگا۔ اس سلسلہ میں شہرستانی کی مشہور کتاب سے چند جملے نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ”نیکی اور بدی۔ پاک و نجس۔ سب روشنی و تاریکی کی طرح وجود میں آئے ہیں۔ اگر ان کا وجود مدغم نہ ہوتا تو دنیا قائم نہ رہ سکتی۔ ہر شے کی ضد کا پیدا ہونا چونکہ لازمی ہے لہذا تاریکی کا وجود عالم آفرینش میں ایک لازمی امر تھا۔ چونکہ عموماً لوگ معمولی دماغ و ذہنیت کے ہوتے ہیں لہذا نیکی اور بدی کا پہلے پہل سمجھنا سوائے اس صورت کے کسی اور طرح دشوار تھا۔“

خواجہ کمال الدین لکھتے ہیں: ”ہم میں اکثر کوئی نامعلوم قوتیں اچھے اور بُرے کاموں کی تحریک کرتی رہتی ہیں ان قوتوں کو قرآن حکیم نے علی الترتیب فرشتہ و شیطان کے نام سے موسوم کیا ہے۔“ نیکی و بدی میں باہم ربط ہونیکے مسئلہ کو حضرت زرتشت نے توام ارواح کی مثال دیکر سمجھایا ہے۔ پھر اس مثال کی روشنی و تاریکی۔ سچ و جھوٹ زندگی و موت جیسی مثالوں کو پیش کر کے وضاحت کی ہے۔ واضح رہے کہ مجسمہ اسی قسم کا موازنہ قرآن و انجیل میں بھی درج ہے ان کتب مقدسہ میں بھی روشنی کو نیکی اور تاریکی کو بدی و گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تاریکی کو گناہ اور شر کا نشان بتایا گیا ایوب ۱۹ آیت ۸۔ قرآن سورہ ۲۴ آیت ۴۰) اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دن کی روشنی نیکی کی علامت اور



شب کی تاریکی گناہ کی علامت ہے۔ بلکہ مندرجہ بالا تقابل اور موازنہ سے اس وقت کے لوگوں کی کم علمی کا خیال رکھتے ہوئے اس مسئلہ خیر و شر کی سادہ الفاظ میں تشریح کو نام مقصود تھا۔ زندگی اور موت کا تقابل بھی اسی طرح نیکی و بدی سے کیا گیا ہے اس جگہ زندگی سے مراد روحانیت اور پاکیزگی کی زندگی ہے اور موت کا مطلب نورایمان سے محروم رہنا۔ ضمیر نیک سے جدا ہونا۔ نیک اعمال کو چھوڑ کر شیطان کا مقلد ہو جانا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ زرتشتی فلسفہ مذہب میں بدی کا نتیجہ موت ہے زرتشتی مذہب کے پیرو موت کو خداوند عالم کی ایک رحمت سمجھ کر بڑی خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کرتے ہیں اُن کا اعتقاد ہے جب روح ہمارے مادی جسم کو چھوڑ کر خالص زندگی بسر کرتی ہے تو اُسے بلند معیار روحانیت کا نصیب ہوتا ہے اور روح تمام آلام و مصائب سے نجات پا جاتی ہے۔ ”موت تکمیل حیات ہے“ (دینکار و جلد پنجم صفحہ ۳۳۰ مترجم پشتون سنجانا) زندگی اس دنیا میں مختصر مگر آئندہ دنیا میں دراز ہے۔ (اندرز خسروی کا داتان نجسم) ”سوائے موت کے تمام امراض کی دوا مقرر ہے“ (دینکار و جلد دوازدہم باب ہفتم صفحہ ۳۷۷) پس ہم اس نتیجہ پر بلا کسی شبہ کے پہنچتے ہیں کہ موت و بدی کا تقابل محض تشریح کی غرض سے دین زرتشتی میں ہوا ہے۔

اب ہم سینا باب سی و یکم کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ اس میں سبب کے ارتقاء اور کشمکش سے بحث کی گئی ہے یہ ترجمہ پروفیسر طیس کے ترجمہ سے ماخوذ ہے۔

(۱) ہم اُن اصول کو بیان کر رہے ہیں جو دروغ پرستوں کو تو یقیناً ناگوار ہوں گے لیکن ان لوگوں کے لئے جو مزد اپرا ایمان یقین رکھتے ہیں یہ بہترین کلام ہے۔

(۲) اگر اس طرح پر تمھاری روح سچائی کو اختیار نہ کرے گی تو میں حسب مرضی اہورا مزدا تمام اُن اختیارات کے ساتھ آؤں گا جو اہورا مزدا اپنے رسولوں کو عطا فرما کر اس دنیا میں حکومت کے لئے بھیجتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُن رسولوں کی بدولت اُس کے بندے اُس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور پاکبازی کی زندگی بسر کریں۔

(۳) اے مزد مجھے اُس سزا سے جو تو نے گناہگاروں کے لئے مقرر کئے اور اُن انعام سے جو تو نے نیکوکاروں کے لئے مقرر فرمائے ہیں مطلع فرما۔ تاکہ میں اُن کا دنیا میں اعلان کروں۔

۱۔ تقابل فرمایئے انجیل میں نور سے مراد روح اور جان ہے۔ اسی طرح تاریکی سے مراد موت ہے۔ قرآن سورۃ ۴۰ آیت ۱۱۔ ۱۲۔ ”شکند کائنات میں“ باب ۸ سطر ۱۸ اور باب ۱۲ سطر ۹ پھر اسکا حدیث جناب ختمی مرتبت منقولہ غزالی کی کیا ہے (صفحہ ۲۰۰ تقابل کیجئے مفتی میر محمد عباس شوستر علی شرمقام نے اپنی تفسیر ”من و سلمی“ میں بڑی خوبصورتی سے اسے نظم کیا ہے۔ ۳۷ ادبیات مقدمہ مشرقی جلد ۳ صفحات ۵۳-۳۶۔



(۴) جب مزدائے خیریتوں کے ساتھ ابدی رحمت ہماری التجا کی طرف متوجہ ہوگی تو دین کی رحمت اور تیری پاکیزگی کی اعانت سے ہم اُس قدرت اور قوت کا مطالبہ کریں گے جس کے ذریعہ ہم شیطان کا قلع قمع کر سکیں۔

(۵) اے راستی مجھے میرے بہترین حق (حصہ) سے آگاہ کرتا کہ میں اُسے تلاش کروں۔ اے پاک منشی مجھے اُس کا پتہ بتلا دے جس کے ذریعہ تمام نیکیاں اور خوبیاں پہچان سکوں۔ اے اہورامزدا مجھے اُن چیزوں سے جو پسندیدہ اور غیر پسندیدہ ہیں مطلع کر دے۔

(۶) اہورامزدا مجھے اپنی سلطنت کے اُس حصہ کا جو پاکبازی کے نور سے منور اور نعمہائے جاودانی سے معمور ہے بتلا۔  
(۷) تو ہر شے پر قادر ہے۔ تو ان تمام نیکیوں اور اچھائیوں کا بانی ہے۔ تو اپنے فیاض دماغ کے پر تو سے ادلیا کے دماغ کو بلند خیال بناتا ہے۔ اور اُن کی پاک ہستیوں کی اعانت کرتا اور انھیں ترقی دیتا ہے (کیونکہ وہ تیرے مخصوص بند ہیں) تو ہمیشہ کیساں ہے۔

(۸) اے اہورامزدا تو ہی اپنے بندوں کے معبود ہونے کے قابل ہے۔ تو ہی پاک منشی کا بانی و مالک ہے۔ میری روشن آنکھوں نے تجھ ہی کو انسان کی نیکیوں اور زندگیوں کا مالک پایا۔

(۹) اے اہورامزدا میں تجھ سے دریافت کرتا ہوں کہ آئندہ کیا باتیں ظہور میں آنے والی ہیں۔۔۔ اور بدکاروں کی کیا سزا ہے۔ ان کا انجام و حشر کس طرح ہوگا۔

(۱۵) اے اہورامزدا اُس کی کیا سزا ہے جو بدی کرتا اور بدکاروں کی مدد کرتا ہے اور پاکباز کسانوں کو تکلیف پہنچاتا اپنا مقصد حیات جانتا ہے؟

(۱۶) اُس کے کلام و اقوال کو سننا چاہئے جو دونوں جہاں کی حقیقت سے باخبر ہو اور وہی ہماری زندگی میں ہمارا رہنما ہو سکتا ہے جو بلا و رعایت حق بات کہہ دیتا ہے اور اے اہورامزدا تیری جلالی ہوئی آگ جو تو نے اپنے بندوں کی بنیائی کی خاطر جلائی ہے اُسی کی مطابقت سے وہ کلام کرتا ہے۔

(۲۱) اہورامزدا دائمی راستی۔ شہریاری۔ پارسائی۔ بردباری اور پاک منشی اسی کو عطا کرتا ہے جس کے قول۔ فعل اور خیال اُسکی (یعنی اہورامزدا کی) مرضی کے مطابق ہوں۔

اس کے بعد زردشت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا لایا ہوا دین تمام دنیا کے لئے یکساں مفید و ضروری ہے اور ان باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زردشت نے دیوبستی کی بیخ کنی کی غرض سے اہورامزدا کی اعانت طلب کی تھی۔



بلاشبہ ابتدا میں دین زرتشتی تمام عالم کے لئے تھا اور اس مقصد کی تکمیل بھی عہد اوئی میں دوسرے مذاہب والوں کو اس مذہب کا پیر و بنا کر کی گئی۔ زرتشت کے حواریں دور و دراز ممالک میں جا جا کر مزدا پرستی یعنی زرتشت کی ذریں تعلیم کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دیو پرستوں کے فرقہ نے بھی ان کی تقلید میں بت پرستی کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ یشتہا میں اکثر ایسے علماء اور اولیاء کا ذکر ہے جو اولاً تورانی تھے لیکن بعد کو اس نئے مذہب پر ایمان لے آئے۔ پہلوی و نیکارد (جلد دوم حصہ پنجم) کی یہ عبارت بھی اس مذہب کے مذہب عالم ہونے پر شاہد ہے۔ ”خالق یعنی اہورامزدا نے اس دین کو محض ایران کے لئے مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ دین تمام عالم کے لئے بھیجا گیا ہے تاکہ یہ مذہب کل اقوام میں پھیلے۔ باعتبار روحانیت اس مذہب کا تمام دنیا کے لئے لازمی قرار دیا جانا اس واسطے ضروری ہے کہ اس مذہب میں بہترین فلسفہ۔ پاک ترین خیالات اور سچے کلمات یکجا مجتمع ہیں۔ علاوہ ازیں باعتبار ظاہری اس لئے مفید ہے کہ اسکی بنیاد پاک اخلاقیات پر ہے۔“

بہر کیف اس کے بعد زرتشت خداوند بزرگ و دانا و خلاق خردوراستی کو مخاطب کر کے اُس کے مختلف اوصاف کو بیان کرتے ہیں اور پھر ہر صفت کے لئے ایک نام مقرر کرتے ہیں۔ اس کے بعد مزداسے عاقبت کے متعلق سوال کرتے ہیں اور مومنین (پیروان زرتشت) کے حقیقی عقاید کے متعلق جو ان کی سعادت و نجات کا باعث ہوگا دریافت کرتے ہیں پھر دروغ پرستوں کے انجام سے باخبر ہونا چاہتے ہیں۔ اور آخری بار مجمع سے مخاطب ہو کر لوگوں کو دیو پرستی سے باز رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

حضرت زرتشت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے متعلق ان کے تصورات و خیالات بہت بلند تھے۔ زرتشت کو خالق مطلق کے متعلق اس قدر معرفت اس وقت ہوئی جب وہ عناصر فطرت کی بے معنی پرستش سے منغص ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی ادراک اور معرفت کی بنا پر خداوند عالم کے واحد الوجود ہونے کی تبلیغ کی اور یہ معرفت تمام مصلحین و پیغمبران مشرق کی تعلیمات دیہی سے ملتی جلتی ہے۔ انھیں خدا کی ذات پر کامل بھروسہ تھا اور نیکی و راستی کی کامیابی کا یقین و اتق تھا۔ دین زرتشت میں معاد یعنی آخرت کا تصور جسمانی نہ تھا۔ زرتشت کے خیال میں بہشت ایک ایسے مقام کا نام ہے جہاں انسان کو راحت و سعادت ابدی نصیب رہتی ہو اور خلاق عالم



کے نور مقدسہ سے بالکل قربت رہتی ہے۔

توریت اور اوستا اس خیال میں متحد نظر آتے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہودیت و دین زرتشتی نے عرصہ تک ایک ساتھ زندگی بسر کی ہے اور دین زرتشتی سے ان کے خیالات بڑی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ جانسن و مولٹن وغیرہ جیسے فضلاء مغرب کا خیال ہے کہ عبرانی ادبیات نے اصول الہامی کو تعلیم زرتشت سے اخذ کیا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پیغمبروں میں زرتشت ہی پہلے وہ پیغمبر تھے جنہوں نے معاد کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار فرمایا۔

اس سلسلہ میں مارخم کی کتاب تاریخ ایران سے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں۔ ”زرتشتی خدائے واحد یعنی ہورامزد پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرنے کے بعد سزا و جزا اور روزِ حشر پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی گرفتاری کے قبل تک یہودیوں میں معاد یعنی آخرت کے متعلق کوئی خاص خیال و اعتقاد نہ تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ دار برٹن نے اس اعتقاد کی غیر موجودگی کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موسیٰ پیغمبر خدا تھے۔ پھر ڈاکٹر ڈبلیو جی اسی ثبوت کو اپنے بحث رسالت جناب موسیٰ میں پیش کرتے ہیں۔ زرتشتیوں کے ساتھ تقریباً نصف صدی زندگی گزارنے کے بعد جب یہود اپنے وطن کو واپس گئے تب انہوں نے بھی اپنے یہاں اس مسئلہ اعتقاد حشر و نشر کو رواج دیا۔ ایرانیوں نے جنت کا نام بہشت رکھا تھا اور یہودیوں نے بھی بعد واپسی اسی نام کو اختیار کیا جیسا کہ یہ لفظ عہد نامہ ورید میں اکثر جگہ مرقوم ہے۔“

الغرض دیگر الہامی مذاہب اور تعلیم زرتشت میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا ہے اور اس پیغمبر ایران کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو ناپاک یا غیر الہامی ہو۔ بلکہ اُن کی تعلیم کا اصل اصول بھی وہی ہے جو تعلیمات موسیٰ۔ عیسیٰ اور محمد مصطفیٰ کا تھا۔ کسی شخص کو پہچانتے کے لئے بہترین ذریعہ اُس کا قول و فعل ہے۔ اس لئے کتاب کا تھا پر اعتماد کر کے جواب تک اصلی حالت میں پائی جاتی ہے، ہم زرتشت کے پیغمبر برحق ہونے کا یقین کر سکتے ہیں۔

کتابِ ہیشہا بھی دین زرتشتی کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ہمیں اُن تغیرات کا حال معلوم ہوتا ہے جو پیشوا یا مذہب نے وقتاً فوقتاً اس مذہب کی بیچارگی اور تنزل کے زمانہ میں کئے ہیں۔ مذہبی تعلیم کا ایسے اوقات میں تبدیل ہو جانا کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ اس طرح کے تغیرات اکثر مذاہب میں پیدا ہوئے ہیں۔



خورد اوستا کا تقریباً ۳ حصہ یشتہا پر مشتمل ہے۔ اور اُس کی زبان و مفہوم دونوں گاتھا سے بالکل متفرق ہیں۔  
یہ تصنیف یقیناً بعد کے لوگوں کی تصنیف ہے اور مذہب زرتشتی میں نئی باتوں کا رواج دینا انھیں مصنفین کا کام ہی  
ہر چند کہ اہورامزدا کا خدا اور زرتشت کا پیغمبر خدا ہونا رکن ایمان رہا لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے اُن اوصاف میں جو حضرت  
زرتشت نے اہورامزدا کے متعلق بیان فرمائے تھے کافی رد و بدل کر دیا۔ خدا کے واحد کی پرستش کو فرشتوں کی  
پرستش سے کچھ اس طرح پر غلط ملط کر دیا گیا کہ خدا کا وجود بالکل نام نہاد ہو گیا اور اسی بات نے ڈاکٹر ولسن (مشہور  
عیسائی مبلغ مقیم بمبئی) وغیرہ جیسے مخالفین دین زرتشتی کو اعتراض والزام کا موقع دیا۔

یشتہا میں پیروان دین زرتشتی کو بعض رسوم و عوائد کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بدعات  
بعد کے پیشوایان مذہب کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ پارسی مصنفین کی کثیر تعداد نے یہ امر بخوبی واضح کر دیا ہے کہ ”مُنغ“ حقیقت  
اُس مذہب کے پیرو تھے جو ظہور زرتشت کے قبل ایران میں پایا جاتا تھا اور اُن کی ایک خاص جماعت بمقام  
”میڈیا“ مقیم تھی۔ جب انھوں نے مذہب زرتشتی قبول کیا تو اپنے زہد و اتقا کی بنا پر مذہبی پیشوایان بیٹھے۔ رفتہ رفتہ جب  
ایرانی مشرق سے مغرب کی طرف بڑھے اور ان زاهدوں (مُنغوں) کو پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہوا تو یہی لفظ ”مُنغ“ جو کچھ  
عرصہ قبل بت پرستوں کا خطاب تھا زرتشتی دین کے مذہبی پیشواؤں کا لقب ہو گیا۔ اور اس طرح موقعہ پا کر ان لوگوں  
نے زرتشتی احکام کے پردہ میں قدیم مراسم و عادات تورانی کو اس مذہب میں رائج کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر مولٹن لکھتے ہیں کہ  
”مراسم کے اضافہ کے ذمہ دار مُنغ ہیں۔ جس طرح پرہندوستان میں آریاؤں کے سیدھے سادھے مذہب کو برہمنوں نے  
پیچیدہ کر دیا اسی طرح مُنغوں نے زرتشتی مذہب میں بہت سی فضول باتیں داخل کر دیں۔

مقدس آتش یا آگ کے احترام میں غلو کو راہ دینا اور مردوں کی لاش کو دھوپ میں اسوقت تک گھلا چھوڑ دینا  
جب تک گدھ گوشت و پوست کھا کر ہڈی کا ڈھانچا چھوڑ دیں، اس مذہب کے مراسم نہیں ہیں بلکہ قدیم تورانیوں سے  
ماخوذ ہیں اور اب زرتشتی مذہب کے ضروری و لازمی عادات میں داخل ہو گئے ہیں۔ مسٹر نریان لکھتے ہیں کہ:۔ زرتشت  
کی بلند اور پاکیزہ تعلیم عہد ساسانی میں مُنغوں کے ہاتھوں اپنی اصلیت سے علیحدہ ہو کر خراب ہو گئی۔ ان لوگوں نے

۱۔ ”اشعار ایران قدیم“ ”میڈیا“ ”تاریخ پارسیان“ اور ”شرع مذہب زرتشت“ — ۲۔ ”مذہب پارسی“ (بیبی ۱۸۴۳ء) —

۳۔ ”میڈیا“ مصنفہ راگزن — ۴۔ عہد اوستا و زرتشت صفحہ ۶۳ — ۵۔ ”خزینہ مَنغ“ صفحہ ۶۴ — ۶۔ دیباچہ



زرتشت کی نیک تعلیم کو ضرورتِ وقت اور رفتارِ زمانہ کے مطابق ڈھالنا چاہا اور اس کا نتیجہ بہت بُرا ثابت ہوا۔  
 ”ڈاکٹر ایڈورڈ فری مین“ لکھتے ہیں کہ: ”عہدِ مابعد میں زرتشت کے بتائے ہوئے اصول کو پیشوایانِ مذہب نے  
 بہت زیادہ پست کر دیا۔ مثلاً ہر مزدجسمانی ہیئت کو آگ قرار دیکر معبدوں میں آگ رکھی جانے لگی اور اس کی بالاعلان  
 پرستش ہونے لگی اسی طرح مندروں کی تعمیر بھی بالکل نئی بات تھی جسے زرتشت نے ممنوع قرار دیا تھا۔“

بہر کیف پارسیوں کے مذہب پر محض اُن کے مراسمِ مذہبی دیکھ کر حکمِ لگانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی خامیوں  
 کا وجود ہمیں اُن اقوامِ دہل میں بھی نظر آئے گا جو موجودہ زمانہ میں اہل کتاب سمجھی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ایک زرتشتی نازداکر  
 کے وقت آفتاب یا آگ کی طرف رخ کرتا ہے لیکن کیا ایک یہودی عبادت کے وقت قربانگاہ کی طرف اپنی آنکھیں  
 نہیں رکھتا۔ کیا عیسائی صلیب کے آگے نہیں جھکتے، اور کیا ناز کے وقت مسلمان قبلہ رو ہو کر عبادت نہیں کرتے؟  
 ایک مجوسی مصنف لکھتا ہے کہ: ”شروع میں جب زرتشتی مذہب کے پیرو ہندوستان آئے تو انھیں  
 مجبوراً بہت سے ہندوؤں کے مراسم اس لئے اختیار کرنے پڑے کہ اُن ریاستوں کے حکمران جہاں انھوں نے سکونت  
 اختیار کی تھی اُن سے خوش رہیں اور اُن کی محافظت دوسری پستی کریں۔ کچھ عرصہ بعد یہ مراسم جو وقتی طور پر اختیار کئے  
 گئے تھے تو ہمت اور غلط فہمیوں کی بنا پر اصل مذہب سے متعلق سمجھے جانے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ہندو انہ مراسم  
 وخصایل پارسیوں میں رائج ہو گئے۔“

اس مذہب پر ایک یہ بھی الزام ہے کہ اس نے حقیقی بھائی بہن کا عقد جائز قرار دیا ہے۔ اس اتہامِ الزام  
 کے بانی وہ یونانی مصنفین ہیں جنہوں نے تعصب اور نادانی سے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت  
 امر یہ ہے کہ قدیم ایرانیوں کے عادات وخصایل سے ان یونانیوں کو مطلق واقفیت نہ تھی اس ناپاک رسم کا ذکر نہ تو  
 دستاویز میں ہے اور نہ پارسیوں کی کسی دوسری مقدس کتاب میں۔ پارسی اس رسم کے وجود سے بالکل انکار کرتے  
 ہیں اور وہ حق بجانب ہیں۔

چچیرے بھائی بہن میں شادی کی اجازت اس مذہب نے بیشک دی تھی اور اسی کو لوگوں نے حقیقی بھائی بہن  
 میں شادی کی رسم سمجھ لیا اور مطعون کیا۔ دائرۃ المعارفِ دین و اخلاق میں لکھا ہے کہ: ”موجودہ پارسی یہ لکھتے  
 ہیں کہ اس رسم کی اصلیت یہ ہے کہ حقیقی چچیرے بھائی بہن میں شادی کی اجازت دی گئی ہے اور بلاشبہ زمانہ موجودہ  
 میں ایسا ہی پایا جاتا ہے لیکن لفظ غیتوہید اتھا کے معنی یونانی اور لاطینی مصنفین نے غلطی سے حقیقی بھائی بہن



لے لئے اور غیر پارسی علماء کی ایک کثیر تعداد اس معنی پر متفق ہے۔

یہ ممکن ہے کہ زمانہ قدیم میں مصر وغیرہ جیسے ملکوں کی اس یہودہ رسم کی اتباع چند بادشاہوں نے کی ہو اور اس فعل قبیح کی اجازت علماء مذہب سے حاصل کر لی ہو لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ مذہب نے ایسی تعلیم دی تھی یا یہ ناپاک رشتہ زرتشتیوں میں شرعاً جائز تھا۔ ہیرودوٹس نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار خمنی سلاطین میں سے ایک سلطان نے جس کا نام کیمبیسس تھا مذہبی علماء سے دریافت کیا کہ حقیقی بھائی بہن میں شادی جائز ہے یا نہیں۔ لیکن جیسا کہ ہیرودوٹس نے لکھا ہے اُن کے جواب سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ امر شریعت زرتشت کے مطابق جائز ہو یا اس رسم کا ایران میں کبھی بھی وجود تھا۔

جارج ادلسن اس الزام و اتہام کی تکذیب میں لکھتا ہے کہ ”منع اور اُن کے ہم مذہبوں پر یہ اتہام تراشنے والا اصل میں ٹیشیانہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا بیان ایسے واقعہ کے متعلق کسی طرح قابل وثوق نہیں ہو سکتا۔“ راگزن لینا کے ایک مخصوص باب کا حوالہ دیتے ہوئے اس بحث پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:۔

”یہ ممکن ہے کہ یہ رسم ایرانیوں میں زمانہ قدیم سے ہو اور اس نئے مذہب نے وقتی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا ہو۔“ لیکن ہم بہت جلد یہ امر ثابت کر دیں گے کہ دین زرتشت نے کسی وقت بھی کسی وجہ سے اس رسم قبیح کی اجازت نہیں دی۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق عہد اول و دور آخر کے تمام کتب مقدسہ مذہب زرتشتی سے ہو سکتی ہے۔

راگزن لکھتا ہے کہ:۔ ”یہ ناپاک رشتہ اور دیگر یہودہ مراسم مضریوں۔ یونانیوں اور رومیوں میں پائے جاتے تھے۔“ ایک یونانی بیوی کو حق حاصل تھا کہ اگر اُس سے کوئی اولاد نہ ہو تو وہ کسی اجنبی سے شوہر کی اجازت لیکر ناجائز تعلق پیدا کرے تاکہ حمل قرار پائے اور اولاد ہو۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی بھائیوں کی شرکت میں محض ایک عورت رہا کرتی تھی

۱۔ ”ادائل دین زرتشت“ مصنفہ مولن صفحہ ۲۰۷ اور عہد اوستا و زرتشت مصنفہ بنجن۔ ۲۔ ”پانچ عظیم الشان سلطنتیں“ جلد سوم صفحہ ۱۳۳۔ ۳۔ ”میدیا باب ۱۲ صفحات ۱۱-۱۱۱۔“ ۴۔ ”ینا کے اس باب کا نہایت ہی صحیح اور نفیس ترجمہ“ منتخبات از ادستاد فارسی قدیم“ مؤلفہ ڈاکٹر آئی۔ جے۔ اس تار پور والا میں موجود ہے۔ تمام غلط فہمیاں لفظی نزاع کی بنا پر ہیں۔ حقیقتاً اس لفظ کے معنی چیرے بھائی بہن ہیں نہ کہ حقیقی اگر حقیقتاً رشتہ اس مذہب میں جائز ہوتا تو یقیناً مذہبی احکام میں کسی جگہ اسکی طرٹ اشارہ ضرور ہوتا مگر مذہبی احکام میں مطلقاً ذکر نہیں ہے۔ ناظرین ”مذہب زرتشت“ مصنفہ آئی۔ جے۔ اس تار پور والا (مطبوعہ مدراس) اور تمدن ایرانیان قدیم مصنفہ کلیمینٹ ہورٹ کا اس سلسلہ میں ضرور مطالعہ کریں۔ ۵۔ ”میدیا“ صفحہ ۱۱۲۔ ۶۔ آثار قدیمہ یونان و روم جلد ۲ صفحات ۳۹-۱۳۴۔ ۷۔ ”سیراڈیشن“۔ ۸۔ مصر قدیم صفحہ ۱۷۲-۶۲-۶۱۔



یونانی اور رومی دیوی اور دیوتاؤں کی نیکی تصاویر اور مجسمے اب بھی نظر آتے ہیں۔ اور یہ امر ان ممالک کے پستی اخلاق اور تمدن کی خرابی پر دلالت کرتا ہے۔ راولنس نے لکھا ہے کہ قدیم مصری معاشرت کے قانون کے مطابق جس طرح ایک حقیقی بھائی اپنی حقیقی بہن سے شادی کر سکتا تھا اسی طرح ایک لڑکا اپنی حقیقی ماں سے شادی کر سکتا تھا۔ بلاشبہ ایرانی سلاطین اور ان ممالک میں بہت زیادہ قریبی تعلقات تھے۔ سپرویس۔ کیمبالس و دیگر بادشاہان ایران اور ان ملکوں سے برابر جنگ رہی۔ اکثر اجنبی ایران میں آکر بس گئے اور ممکن ہے کہ ان تعلقات نے ایرانی تمدن پر بھی اثر کیا ہو۔ ایک بار کیمبالس نے حقیقی بھائی بہن کے درمیان شادی ہونے کے متعلق استفسار کیا تھا لیکن علمائے مذہب نے کسی ایسے ایرانی یا زرتشتی شریعت کے وجود سے انکار کیا۔ عہد ساسانی میں جب محمد مزدک نے اپنی غلط رسالت کا دعویٰ پیش کیا تو اکثر ناپاک و قبیح مراسم کو بھی داخل مذہب کرنا چاہا لیکن جب نوشیروان تخت ایران پر شکم ہوا تو ان تمام خرافات کا بالکل قلع قمع کر دیا اور دین زرتشتی پھر سلطنت کا مذہب بن گیا۔ لیکن جب ایران کی قومی سلطنت کا زوال ہوا تو کل انتظام ابتر ہو گئے اور عام طبقے میں پھر بد اصولیاں شروع ہو گئیں جب پیروان دین زرتشت ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تو انھوں نے اپنے دیگر مخصوص قوانین کے ساتھ ایک قانون شادی بیاہ کے متعلق بھی حکومت برطانیہ کو بنانے پر مجبور کیا۔ یہ قانون ”پارسی شادی و طلاق“ (۱۸۶۵ء) کے عنوان سے مشہور ہے۔ اس قانون کی غایت و غرض یہ تھی کہ وہ اس رسم کو اپنے مخصوص مذہب اور تمدن کی مطابقت سے انجام دیں۔ اور ہم کو اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخصوص رسم کے متعلق ان کے مذہب اور تمدن کے احکام بھی اسی طرح پاکیزہ ہیں جس طرح مسلمانوں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں مروج ہیں۔ موجودہ ایرانی زرتشتیوں میں مروج رسوم کے متعلق مستند حالات ہمیں کولمبیا یونیورسٹی امریکہ کے ایک پروفیسر ویلیم جیکسن کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے ایک عرصہ تک ایرانی زرتشتیوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور ان کے مراسم و عادات کا غائر نگاہ سے مطالعہ فرما کر اپنی ایک تصنیف میں بوضاحت

۱۔ ”تاریخ مناکحت انسانی“ کے مصنف جلد اول ابواب پنجم و ششم میں اوگسٹائن ہیر وڈوٹس۔ بلاؤٹس اور دیگر ماخذ سے نقل کرتے ہیں لیڈین۔ آرمینین۔ ساپیرین۔ فینتھین۔ ایڈریسکین اقوام میں یہ جائز تھا کہ لڑکیاں قبل مناکحت ناجائز کسب کر کے روپیہ کمائیں۔  
 ۲۔ ”دبستان مذہب“ مصنفہ محسن فانی۔ البیرونی۔ کتاب المعارف اور مروج الذہب وغیرہ۔ ۳۔ اس قانون کے منظور ہونے کے سلسلہ میں مفصل معلومات تاریخ پارسیان جلد ۲ مصنفہ کارکاسے حاصل ہو سکتے ہیں۔



ذکر فرمایا ہے۔ پروفیسر مذکور نے اپنی کتاب میں کسی جگہ بھی اس ناپاک رشتہ و رسم کے وجود کا ذکر نہیں کیا۔ اگر حقیقی بھائی بہن میں مناکحت کا دستور کسی زمانہ میں بھی ایران میں ہوتا تو یقیناً انھیں اس کا پتہ مل جاتا اور وہ درج کتاب کرتے۔ ہیر وڈٹس کی مذکورہ روایت کے علاوہ ایک مستند کتاب مصنفہ رنن بھی ہے۔ رنن نے واقعہ ”مراجعت دہ ہزار“ کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ رنن نے اپنی تصنیف میں کسی مقام پر بھی ایران کے امراء۔ رؤساء و سلاطین یا طبقہ عام میں اس قسم کی رسم قبیح کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ لکھتا ہے کہ ملک ایران دوسرے ممالک کے برخلاف مجھض قوانین بنا کر جرائم کا انسداد کرتا ہے بلکہ لوگوں کے اخلاق و آداب کو بھی سدھارتا ہے۔ اس ملک میں بچوں کو شروع ہی سے سخت و شدید قوانین و احکام کے ذریعہ پاکیزگی اور مذہب کا پابند بنا دیا جاتا ہے۔

بلاشبہ زرتشتی مذہب کے ادبیات میں لفظ خیتوھیدا تھا مرقوم ہے لیکن اس لفظ کے معنی ”رشتہ داروں کے درمیان شادی“ ہے۔ اس لفظ کے حقیقی معنی بتانے کے لئے ہم ایک معروف پارسی مصنف فرانچی کار کا کی عبارت نقل کرتے ہیں:۔ ”اس کے اصلی معنی خود کو تفویض کر دینا ہے۔ اس آخری معنی کے اعتبار سے مذہب یا خدا کے کاموں میں خود کو لگا دینا یا حوالہ کر دینا ہے۔ اوستا میں اس لفظ کا استعمال اسی معنی میں کیا گیا ہے۔“

اس مسئلہ پر ایک مفصل بحث ”جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی برانچ“ ۱۹۶۷ء میں کی گئی ہے۔ اس مجلہ میں ایک فاضل ”داراب دستوریشتون سنجانا“ نے جو مذہب زرتشتی ہیں ”قدیم ایران میں حقیقی بھائی بہن میں شادی کا اتہام“ کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔

اب ہم دوسرے مسئلہ پر بحث کریں گے یعنی مردوں کی لاش کو دھوپ میں گدھ کے آگے رکھ دینا۔ سو اس رسم کا پتہ ہمیں پیدائش زرتشت سے قبل کے زمانہ میں ملتا ہے۔ یہ رسم اصلاح و تعلیم زرتشت سے قبل مشرق میں جاری تھی جیسا کہ خود ایک پارسی مصنف سٹرامی۔ اس مسانی اقرار کرتے ہیں۔

ہیر وڈٹس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اس رسم سے پرہیز کرتے تھے اور بجائے اس کے کہ مردہ کو

۱۔ ”ایران گزشتہ و امروہ“ مصنفہ پروفیسر جیکسن۔ ۲۔ تعلیم ہیر وڈٹس ملاحظہ ہو۔ ۳۔ ۱۹۰۱ء سال قبل مسیح۔

۴۔ ”زینوفون“ مصنفہ الکزنڈر گرانٹ صفحہ ۱۲۸۔ ۵۔ تاریخ پارسیان جلد دوم صفحہ ۱۶۳ اور ”زرتشتی خواتین کا مرتبہ عہد قدیم میں“ مصنفہ پشتون سنجن صفحات ۴۹-۴۸۔ ۶۔ ”مذہب زرتشتی“ صفحہ ۲۸۴ ملاحظہ فرمائیے۔ ۷۔ دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲۴ صفحہ ۸۲۳۔



زیر آسمان چھوڑ دیں اُسے دفن کیا کرتے تھے۔ اس رسم کا وجود محض پیشوایان مذہب میں تھا اور یہ اُن کی اجتہاد کی بنا پر تھا۔ عموماً ایرانی (پارسی) لاش کو موم سے ڈھاک دیتے تھے۔ عہدِ اُخمنی تک طبقہ مُغ یا پیشوایان مذہب نے اس قدر اقتدار نہیں حاصل کیا تھا کہ عام لوگوں کو اپنی تقلید پر مجبور کرتے۔ سیروس اور دیروس وغیرہ سلاطین کے قبور و مقابر کی موجودگی اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاندانِ اُخمنی کے زوال کے بعد دینِ زرتشت بھی تنزل کا شکار ہوا اور عہدِ ساسانی میں ان پیشوایان مذہب کا اقتدار بھی بہت زیادہ بڑھ گیا۔ چنانچہ مغوں نے دیگر بدعات کے ساتھ اس رسم (مردہ کو زیر آسمان کھلا چھوڑ دینا) کی پابندی بھی عام پیروانِ زرتشت پر لازمی قرار دیدی۔

مغربی محققین اس رسم کو میڈیا کے رہنے والوں میں ظہورِ زرتشت سے بہت قبل رائج بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر دھلا لکھتے ہیں کہ۔ ”مُغ عناصرِ فطرت کو مقدس سمجھتے تھے لہذا اُن کے خیال میں زمین کو پاک رکھنا ضروری تھا“ پس اسی خیال کی ماتحت اس رسم کا رواج ضرور عام کیا گیا۔

آخرم کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ساسانی خاندان کے آخری تاجدار یزدگرد کی لاش اُس کے مرنے کے بعد اتھخز لائی گئی اور وہیں اپنے بزرگوں کے مقبرے میں سپردِ خاک کی گئی۔ علاوہ ازیں داریوش کے متعلق بھی ڈاکٹر دھلا لکھتے ہیں کہ جب وہ جنگ میں مارا گیا تو اُس کی لاش ایرانِ بھیدی گئی یہاں وہ اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ شاہی مقبرہ میں مدفون ہوا۔

اس سے لازماً ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ یہ رسم عہدِ آخر کے اوستا میں اس مرقوم عقیدہ کے باعث وجود میں آئی کہ زمین کو ناپاک نہ کرنا چاہئے۔ زمانہ حال کے اکثر پارسی اس رسم کو بنظرِ اکراہ دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اس رسم سے مخصوص پر خاش کی اسلئے ضرورت نہیں کہ جہاں تک اصل تعلیم مذہب کا تعلق ہے اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ اکثر عیسائی مردوں کے دفن کرنے کے خلاف ہیں اور جلاسنے کی رسم کو روز بروز ترقی دے رہے ہیں حقیقت امر یہ ہے کہ اعتقادات یا کسی مذہب کی تعلیم سے رسوم و عادات کا کوئی تعلق نہیں اور مراسم کا اختلاف زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔

اس بحث کے اختتام پر ڈاکٹر مونیر ویلیم کے خیالات (مرقومہ کتاب ہندوستان جدید صفحہ ۶۳ ۱۸۷۹ء مطبوعہ لندن)

۱۔ زینوفون لکھتا ہے کہ خود سیروس نے بھی یہ وصیت کی تھی کہ اُس کی لاش مرنے کے بعد دفن کی جائے۔ ۲۔ دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲ صفحہ ۸۲۳۔  
 ۳۔ ”تاریخِ مُغ“ مصنفہ مولن صفحہ ۶۳۔ ۴۔ ”تاریخِ ایران“ صفحہ ۹۴۔ ۵۔ ”تاریخِ ایران“ صفحہ ۶۹۔ ۶۔ ”تاریخِ ایران“ صفحہ ۶۹۔



نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ جس طرح اہل یورپ پارسیوں  
رسم کو برا سمجھتے ہیں اسی طرح پارسی اپنے نقطہ نگاہ سے یورپ کی مروجہ رسم دفن کو یقیناً قابل مذمت سمجھتے ہوں۔  
جب اپنے مردوں کو زیر زمین مدفون کرتے ہیں تو اس خیال سے کہ صد ہا کیرے اُن جسموں پر حملہ آور ہوں گے با  
خوف نہیں کھاتے کیونکہ ہماری نظروں سے یہ واقعہ پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی طرح پارسی بھی اپنے مردوں پر گدھوں کو  
حملہ کرتے نہیں دیکھتے اور نہ اُن کی موجودہ شریعت دیکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور اُن کا یہ سوال حق بجانب ہوگا کہ  
حفظانِ صحت کے نقطہ نظر سے کون قاعدہ زیادہ بہتر اور انسب ہے؟

بہت ممکن ہے کہ اس رسم کو طبقہ مُغ نے کسی دوسرے خیال سے بھی رواج دیا ہو۔ ان لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ  
مصری اپنے مردے مستحکم اسہرام (جو اب تک موجود ہیں) میں رکھتے اور ہندی اپنے مردے جلادیتے ہیں اور چونکہ یہ  
دونوں قومیں بت پرست و مشرک تھیں پس انھوں نے مشرکوں کی رسم سے اپنے رسوم کو مختلف کر دینے اور مطابقت  
نہ رکھنے کے خیال سے قدیم تورانی رسم پر عمل کرنا شروع کر دیا ہو۔ اس رسم کی تفصیل کے لئے رسالہ تھیسوفیٹ ماہ  
اگست و ستمبر ۱۹۱۲ء (مضمون شمس العلماء جمشید جی مودی) کا مطالعہ مفید ہوگا۔

المختصرہ مضامین اور مسائل جو شہتا میں خلاف عقل اور قابل اعتراض نظر آتے ہیں انھیں خود پارسی بھی بُرا  
اور بیکار خیال کرتے ہیں اور اس لئے ان کو سامنے رکھ کر ہمیں یا کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔  
مترجم سید وجاہت حسین ام، اے  
پروفیسر طاہر رضوی ام، اے

## مکتوبات نیاز

ادب و انشاء کی دنیا میں مکتوبات نیاز وہ چیز ہیں جنکی  
نظر آپ کو مل ہی نہیں سکتی۔ زبان کی صحت و پاکیزگی، طرز  
اداکی میساختگی، ادبی شوخیوں کی ملاحیت اور پاکیزہ اور  
صحت۔ یہ تمام باتیں بیک وقت اگر آپ کو کسی جگہ نظر آ سکتی ہیں  
صرف "مکتوبات نیاز" میں۔ کتاب زیر طبع ہو۔ اشاعت کے بعد قیمت  
علاوہ محصول تین روپیہ اور اشاعت کے قبل صرف دو روپیہ۔  
منیجر نگار لکھنؤ

## تذکرہ معرکہ سخن شائع ہو گیا

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ  
ہے جس میں زمانہ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام  
مشہور شعراء فارسی و اردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے  
ہیں مع جواب دہ محاکمہ کیا کر دے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے  
شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت مع محصول  
منیجر نگار لکھنؤ



# دیر و حرم کے قصے

## جہاں آرا اور چھتر سال

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی سب سے بڑی اور نہایت چہیتی بیٹی تھی۔ داراشکوہ (دلی عہد) بھی سب بہنوں میں اس کو زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ بڑی صائب الرائے اور روشن خیال شہزادی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتی تھی۔ اُس کی نگاہ میں سلطنت تیموریہ کے بقا و عروج کا راز اور متحدہ ہند کی قسمت کا فیصلہ اکبر کے روادارانہ مسلک میں نہ ہاں تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ خاندان تیموریہ کا چراغ اگر کوئی روشن رکھ سکتا ہے یعنی اگر اکبر کا نام لیوا کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف داراشکوہ ہے۔ داراشکوہ کی جانب داری کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ سیاسی مصلحت کی بنا پر اکبر نے شاہی خاندان کی بیٹیوں کو کسی کی زوجیت میں دینا ممنوع قرار دیا تھا۔ اس لئے خاندان مغلیہ کی شہزادیاں بالعموم ناگتھار بھی جاتی تھیں لیکن شاہی احکام تقاضائے فطرت کو تو مٹا نہیں سکتے، شہزادیاں لاکھ شہزادیاں ہوں پھر بھی انسان ہوتی ہیں۔ جہاں آرا بیگم کا دل محبت کی چوٹ کھائے ہوئے تھا وہ اپنے محبوب سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن بادشاہ کی اجازت ملنی غیر ممکن تھی۔ ایک دفعہ داراشکوہ نے جہاں آرا کی شادی نجابت خاں کے ساتھ کرنے کی تجویز شاہجہاں کے روبرو پیش کی تھی لیکن بادشاہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ داراشکوہ کا خیال اس معاملہ میں مختلف تھا۔ گو جہاں آرا کو اپنے محبوب سے شادی کرنے میں دشواریاں نظر آتی تھیں تاہم اُسے یقین تھا کہ جب داراشکوہ تخت و تاج کا مالک ہوگا وہ کسی نہ کسی طرح سمجھا بھجا کر اُسے رضا مند کرے گی اس لئے جہاں آرا اور بھی داراشکوہ کی معین و مددگار تھی۔ سلطنت کے اہم مسائل میں بادشاہ اکثر اُس سے مشورہ کرتا اور دلی عہد اُسکی بات پر ہمیشہ کان دھرتا تھا۔ اُسے اپنے مرتبہ کی عظمت اور اُس کی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ وہ زندگی کی آئینہ تصویر تو کاخندہ پیشانی سے استقبال کرنے کو تیار ہو رہی تھی اُس کی امیدیں اور آرزوئیں سہری بھری تھیں۔ طبیعت کی انگلیں اور ارمان خوش خوش نکلنے کے لئے بچپن سے مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ مقدر سے کسی کا بس نہیں چلتا۔



پادشاہ کی علالت کی خبر پھیلتے ہی ہوا کچھ ایسی بدلی کہ ملک میں طوفان برپا ہو گیا۔ بھائی بھائی اور باپ بیٹے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔ شجاع مراد اور اورنگ زیب ہر ایک "تخت یا تابوت" کا نعرہ بلند کئے ہوئے دارالسلطنت پر بیغار کر ہاتھا۔ اورنگ زیب کا وار چل گیا۔ باپ کو قید کر کے بیٹے نے تخت و تاج پر قبضہ کیا۔ داراشکوہ کچھ عرصہ سرگرداں و پریشاں مارا مارا پھر اکیلا بالآخر قید اور قتل ہوا۔ انقلاب زمانہ نے جہاں داراشکوہ کو مٹایا جہاں آرا کو بھی زندہ درگور کیا۔ باپ کے ساتھ بیٹی بھی قید ہوئی۔ اُسے قید ہونے کا اتنا غم نہ تھا جتنا زندگی کے ارمانوں اور اُمنگوں کی اُس دنیا کا ایک تخت مٹ جانا جو اُس نے اپنے دماغ میں بسائی تھی۔ جس جنگ میں اورنگ زیب نے داراشکوہ کو شکست دیکر دارالسلطنت پر قبضہ کیا اُسی جنگ میں جہاں آرا کا محبوب بھی اپنی دلیری اور جانبازی کا کرشمہ دکھا کر کام آیا۔ جہاں آرا کو جب یہ خبر ملی تو کلیجہ مسوس کر رہی۔ درِ دل راز سر بستہ تھا اس لئے اُن کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ خون کے آنسو روتی لیکن چپ رہتی۔ اورنگ زیب نے داراشکوہ کا سر قلم کر کے باپ اور بہن کو تحفہ میں بھیجا۔ دیکھتے ہی زمین پاؤں کے تلے سے نکل گئی۔ کلیجہ پھٹنے لگا۔ زندگی کا آخری سہارا بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ جہاں آرا اب قید خانہ میں بے یار و مددگار زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ مایوسی کے عالم میں پڑے پڑے ایک دن سوچنے لگی کہ آخر یہ ہیجان غم و اندوہ کب تک دل کے بہلانے کی کچھ سبیل تو ہونی چاہئے۔ رفتہ رفتہ اس خیال نے ارادے کی صورت اختیار کی۔ دن تو ادھر ادھر کی باتوں میں کاٹ دیتی لیکن شام ہوتے ہی جب شمع و پروانہ کے سوز و گداز کا تماشہ آنکھوں کے سامنے ہوتا تو یہ بھی قلم ہاتھ میں لے کر اپنے دردِ محبت کے پُر لطف تصور کا نقش کھینچنے لگتی اور اس طرح طبیعت بہلاتی۔ جوں جوں طبیعت لگتی گئی محبت کی یاد نے خواب و خیال کی باتوں سے تجاوز کر کے داستانِ زندگی کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے اوراق پریشاں جہاں آرا کی قید حیات سے رہائی کے بعد بھی زمین کے کسی کونے میں پڑے رہے۔ صدیوں بعد جستجو کرنے والی نگاہوں نے ان اوراق پریشاں کو عمر گمنامی سے نکالا اور داستان کو مرتب کیا۔ یہاں سے نکل کر یہ پیش بہا خزانہ یعنی فارسی کا قلمی نسخہ جس پر ذیقعدہ ۱۰۶۹ھ ہجری کی تاریخ درج تھی پیرس یا لندن کے عجائب خانہ میں عرصہ تک محفوظ رہا۔ چند سال کی بات ہے کہ آندرے ہتوشوں نامے ایک فرانسیسی خاتون مشرق کی سیروسِ سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئی۔ اسلامی دور کی عظمت کی یادگاریں آگرہ۔ فتحپور سیکری۔ اور دہلی میں دیکھتی ہوئی حضرت نظام الدین شاہ اولیا کی درگاہ پر پہنچی۔ کسی نے ایک قبر کی لوح کے پتھر کی طرف اشارہ کر کے دکھایا۔ اس پر شہزادی جہاں آرا بیگم کا نام



کندہ تھا۔ قبر کس میرسی کی حالت میں زبان حال سے گویا تھی۔

بر مزارِ باغریاں نے چراغ نے گلے سے پرے پردانہ سوز دے صدائے بلبلے

یہ خاتون ابھی ابھی شاہجہاں اور ممتاز بیگم کا مزار تاج محل میں دیکھ کر آئی تھی۔ بیٹی کے مزار کی یہ کس میرسی کی کیفیت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس معمہ نے دلچسپی پیدا کی۔ تحقیق و جستجو میں مصروف ہوئی۔ حسن اتفاق سے جہاں آرا کی سرگزشت کا قلمی نسخہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ فارسی سے غالباً فرانسیسی میں اور اب انگریزی زبان میں یہ نسخہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ تاریخ کی تاریخ ہے اور فسانہ کا فسانہ۔ تاریخ کی تحقیق اور چھان بین کا نہ دماغ ہے نہ یہ موقع، البتہ جہاں آرا کی ناکام محبت اور دردِ دل کا مرقع جو خود اُس کے قلم کا کھینچا ہوا ہے اخذ کر کے اُردو کے رنگ و لباس میں ہر یہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض چوٹ کھائے ہوئے دل اسکی قدر کریں۔ جہاں آرا اپنی بیٹی یوں شروع کرتی ہے:-

انگوری باغ میں سرشام چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ ہر نگہار بھول رہا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے اُن کی ہلک سے دماغ کو معطر کر رہے ہیں بجز آبشاروں کے زمزمہ کے ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے اس عالم سکون میں دُلا رے کی بانسری کے بول میری طبیعت کو اسی طرح بیکل کر دیتے ہیں جس طرح بند رابن کی کنجوں میں کنہیا کی بانسری رادھا کے من کو موہ لیا کرتی تھی۔ یہ عنقوان شباب کے نشہ کا سرور تھا جو بہت جلد جا تا رہا۔ اب تو دُلا رے کے نقشہ کے خدو خال کا دھیان بھی یاد سے محو ہو گیا۔ مجھے اُس کی شکل بھی اچھی طرح یاد نہیں۔ لیکن پیار اور محبت کے راگ کو جس نے اور دُھن میں اُس نے چھیڑا تھا وہ من میں کچھ ایسی بس گئی کہ اُس کا سوز و گداز زندگی کا سودا ہو کر سر میں سما یا۔ وہی انگوری باغ ہے وہی سبزہ اور چمن لیکن پھولوں کی ہلک اب طبیعت میں وہ مستی اور خروش پیدا نہیں کرتی۔ چاندنی اب بھی کھلی ہوئی ہے لیکن اس میں اب وہ نگہار نہیں۔ آبشاروں کا زمزمہ کانوں پر بار معلوم ہوتا ہے۔ دُلا رے کی بانسری کے بولوں کی یاد بھی اب طبیعت میں گدگدی پیدا نہیں کرتی۔ شباب کے ساتھ شباب کی رنگ رلیاں بھی گئیں۔ ارمان اور اُشگوں کے مٹنے کے بعد صرف حسرتیں رہ گئیں۔ زندگی کی کایا پلٹ ہو چکی۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ پھر یہ ماجرا کیا ہے کہ شباب میں محبت کی چوٹ کھایا ہوا دل آج بھی دکھتا ہے۔ اس زخم کو تو بدلتی ہوئی کہ مند مل ہو جانا چاہئے تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ عمریں گزریں کہ ساقی کے ہاتھ سے جام لے کر صرف ہونٹوں سے لگانے کی گنہگار ہوئی تھی اور محبت نشہ ہے کہ آج تک نہیں اُترتا اُس کا سرور مجھے آج بھی ایسا ہی مست اور دیوانہ کئے ہوئے ہے کہ جیسے روز اول عہد شباب کو گزرے جُگم ہو گئے لیکن کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب میں نے اپنے محبوب کو پہلے پہل دیکھا تھا۔



شہنشاہ دیوان عام میں دربار کر رہے تھے۔ راجہ اور مہاراجہ پنج ہزاری اور مفت ہزاری سردار مجرا عرض کرنے کے بعد صف باندھے دست بستہ کھڑے تھے۔ میں محل کے جھروکے کی جالی سے کھڑی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی کہ راجہ نرالے بالکین کی ادا کے ساتھ شاہی تخت کی جانب آہستہ آہستہ بڑھتا دکھائی دیا۔ اُس نے مودبانہ قدمبوسی کی اچھ نظر پڑتے ہی مجھ پر سنناٹا سا چھا گیا۔ میں نے تل کی تصویر دیکھی تھی۔ اس جوان رعنا کو دیکھتے ہی مجھے اُس کا شبہ ہوا۔ اس کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں جوانی کا سرور تھا۔ ہر ادب اتنا ہی تھی کہ راجپوت سوہیر ہے۔ ابھی نگاہیں بھی چار نہیں ہوئیں تھیں کہ اُس کا جادو مجھ پر چل گیا میں اُس کی زر خرید لوٹدی تھی اور وہ میرے دل و جان کا مالک۔ وہ دن ہے اور آج میں نے پھر کسی اور پر وہ نگاہیں نہیں ڈالیں مجھے حیرت تھی کہ بڑے بڑے دیوتاؤں کو چھوڑ کر دینتی نے تل کے گلے میں کیوں جے بال ڈالا تھا۔ اُس لمحہ میں نے محسوس کیا اور آج بھی اُسے بھولی نہیں ہوں کہ اس میں کیا راز پنہاں تھا۔ سنتی ہوں کہ میرے بھائی اورنگ زیب نے شاہی حکم صادر کیا ہے کہ گانا بجانا حرام ہے اور ارباب نشاط نے اپنے ساز و سامان کو تجھیز و تکفین کے ساتھ دفن بھی کر دیا ہے لیکن سوز و محبت کا وہ راگ جس کے لئے میں زندگی بھر بچپن رہی اور اُس کی وہ دُھن اور لے جو میرے من میں سمائی ہے بغیر اپنا سماں باندھے نہیں رہ سکتے۔ یہ سوز و ساز شاہی حکم کا پابند نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے راگھی بند بھائی کا روزانہ انتظار کیا کرتی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا وہ آئے گا اور مجھے ملے گا۔ جو راگھی میں نے اُس کے ہاتھ میں باندھی تھی وہ اُس کی قدر کرتا تھا اُس نے میرا ساتھ دینے اور حفاظت کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ایک دن جب سوج ڈوب چکا تھا اور آسمان پر تارے چھٹکنے لگے تھے سرشام وہ آیا۔ اُسے آتے دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں ٹخن برج میں سنگ مرمر کی جالی سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ اُس نے سلام کیا میں جواب دیکر بیٹھ گئی اور سر سے پاؤں تک اُس پر ایک نظر ڈالی۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میرے سامنے کوئی فرستہ کھڑا ہے۔ بات کرنا چاہتی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں ایک لمحہ کے سکوت کے بعد میں نے کہا۔

آپ تشریف لائیے۔ بڑی تکلیف کی۔

راؤ راجا۔ (مسکراتے ہوئے)۔ شہزادی آپ یہ کیا فرماتی ہیں۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ ہمیں یاد ہے کہ شہنشاہ نے بڑے گارڈے وقت میں ہماری مدد کی تھی اور ہم کو تباہی سے بچایا تھا۔ ہر راجپوت کے دل پر آپ کے والد ماجد کی اطا و وفا کا نقش جما ہوا ہے جب تک ان ہاتھوں میں تلوار کا قبضہ کپڑے کی سکت ہے یہ ہمیشہ آپ کے ننگ ناموس کے لئے بے نیام رہے گی۔



میں۔ اور خود آپ کانگ و ناموس؟  
 راؤ راجا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور افسردہ لہجہ میں اُس نے کہا۔ سر زمین ہند زیر عتاب ہے۔ ہم نے خود اُسے اپنے ہاتھوں غارت کیا ہے۔ بھلا ہوان برہمنوں اور چھتریوں کا جو اُس کے ننگ و ناموس مٹانے کا باعث ہوئے۔ شہزادی! آپ کی رگوں میں تو خود راجستھان کا خون دوڑتا ہے۔ آپ کو تو میواڑ کے سامرسی کا قصہ یاد ہو گا جب وہ دہلی اور اجمیر کے مہاراجہ اور ہند کی راجدھانی کی سلامتی کے لئے محمود غوری کے خلاف جنگ آزما ہوا تھا۔ آدھی رات بعد پلنگ پر پڑے پڑے اُسے ایک نورانی صورت دکھائی دی اور کسی نے اُس کے کان میں کہا کہ ”تیرے بعد ہندوستان ہاتھ سے نکل جائے گا“ کئی سو برس ہو گئے کہ دہلی کی راجدھانی مٹ گئی اور ہند کے عروج کا آفتاب اس لئے غروب ہو گیا کہ ہم راجپوت جو اُس کے ننگ و ناموس کے محافظ تھے خود آپس میں اُس کے تخت و تاج کے لئے لڑنے لگے۔

میں۔ راجپوتوں میں لڑائی تو فوج کی راجکماری سنجو گتا کے لئے ہوئی تھی۔ راؤ راجا تمہیں یاد ہے کہ جب پرتھوی راج رن پر جا رہا تھا تو راجکماری نے اُس سے کہا تھا کہ چھتری کے لئے رن میں جان دینا امر ہونے کے برابر ہے اور جب وہ خود ستی ہوئی تو اُس کی زبان پر یہ لفظ تھے کہ۔ ”یہاں نہیں میں پرلوک میں اپنے سوامی سے ملوں گی“ کیا تمہارا بھی عقیدہ ہے کہ جو اس دنیا میں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بچپن رہتے ہیں لیکن زندگی میں ان کو یہ خوشی حاصل نہیں ہوتی انہیں موت ملا دیتی ہے؟

میں نے اپنے سوز محبت کے اُس راز کو جو ایک عرصہ سے میری طبیعت کو بچپن کے ہوئے تھا اس سوال کے چند لفظوں کی تہ میں چھپانے کی کوشش کی۔ میں نے سوال ڈرتے ڈرتے کیا تھا اور جواب سننے کے لئے بیتاب تھی۔ اُس کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ میرے افسردہ دل کی کلی کھل گئی۔ اُس نے جواب میں کہا۔ شہزادی۔ چتا کی بھڑکتی ہوئی آگ انسان کی روح کو پاکیزگی نہیں بخشتی۔ اس سے شانتی حاصل ہوتی ہے جس طرح گیان انسان کو سنسار کے مایاموہ سے چھٹکارا دلا کر نردان کی خوشی میسر کرتا ہے اسی طرح سے بھگتی دوتا ابو کو ایک جان بنا دیتی ہے۔ اس میں دنیا اور عقبی کی تخصیص نہیں۔

ان لفظوں نے میرے مجروح دل پر مرہم کا کام کیا۔ میں جالی سے اور قریب تر ہو گئی گویا کہ صرف یہی ایک پردہ مجھ میں اور میری خوشی میں حائل تھا۔ کاش میں اسے ہٹا دیتی۔ خوشی سے میرا بُرا حال تھا۔ لیکن اس کے چھپانے کے لئے میں نہ معلوم کیا کیا فقرے سوچ رہی تھی۔ مقدر کا لکھا کسی نے مٹایا نہیں۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے



دیوان عام میں فانوس روشن تھے لیکن گانے کی آواز اب سنائی نہ دیتی تھی صرف آبشاروں کا زمزمہ باقی تھا اسکے سوا ہر طرف خاموشی طاری تھی اور ہم دونوں آہستہ آہستہ باتوں میں مشغول تھے۔ میں آئندہ کی دقتوں کا ذکر کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ راؤ راجا سے پیمانہ وفا کرنا استوار کراؤں۔

راؤ راجا۔ ”ایک زمانہ ہوا کہ ہندوستان کا شہنشاہ اکبر تھا۔ اُس کی سلطنت ہمالہ سے دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُسی کا ہم عصر رانا پرتاپ تھا گو اُس کا راج بہت محدود تھا لیکن وہ میواڑ کے سامری کے تخت پر بیٹھا تھا پرتاپ کا عقیدہ تھا کہ اپنے ترکہ اور ورثہ کو ہاتھ سے گنونا سامری کے ننگ و ناموس کو برباد کرنا ہے۔“

جونہی راجا نے یہ داستان پارسینہ چھیڑی مجھے اپنا بچپن کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب شام کے وقت محل میں میری اتالی مجھے میواڑ۔ بوندی اور امیر کے دلاویز افسانے سنایا کرتی تھی۔ میں نے راؤ راجا کا قطع کلام کیا اور بے تابانی سے بول اٹھی۔

اکبر کا دادا بابر تھا جس نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ پرتاپ رانا سانگا کا پوتا تھا جو بابر کا سب سے بڑا غنیم تھا جب بابر شکست کھا کر فرغانہ سے لوٹا تو ایک چھوٹی سی فوج سے اُس نے ابراہیم لودھی کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کیا اور اسی جرار فوج سے تمام راجستھان کے راجاؤں کا مقابلہ کیا۔ راجا تمھیں وہ روایت یاد ہے کہ ایک دن بابر کو سنگین خطرے کا مقابلہ تھا تو اُس نے اپنے ہوش سنبھالے۔ شراب سے توبہ کی اور سونے چاندی کے صراحی و ساغر سبھوں پر لات مار کر شراب لونڈھا دی۔ اُس کے تین سو سرداروں نے بھی اُسی کی تقلید کی اور تمام فوج جو باؤس ہو رہی تھی پھر تازہ دم ہو کر لشکر اکبر کا نعرہ بلند کرتی ہوئی فتح یا موت کے لئے تیار ہو گئی۔ رانا سانگا کی فوج کثیر تھی لیکن چونکہ وہ غافل تھا اسی لئے بابر کو فتح اور سانگا کو شکست ہوئی۔ سانگا بے پروا اور غافل کیوں رہا؟۔ یہ سن کر راؤ راجا کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اپنی نظریں میری طرف گاڑ کر بولا:-

ہم ہندو اے مقدر کو اس حد تک گھورنے کا موقع دیتے ہیں کہ وہ بالآخر ہمیں اندھا کر دیتا ہے۔ شاید یہ غیبی آواز آخری مرتبہ چتوڑ میں اُس وقت سنائی دی تھی جب میواڑ کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اُس نے رانا سانگا سے کہا کہ اُسی کے قبیلے سے کوئی غدار اُس کے ننگ و ناموس پر دھبا لگائیگا۔ رانا سانگا بڑا پرتابی راجا تھا۔ اُس نے یہ معلوم کئے رن سر کئے تھے۔ اُس کے جسم پر انشی زخموں کے نشان تھے۔ وہ اپنی ایک آنکھ اور ایک بازو بھی تلوار کی نذر کر چکا تھا۔ میدان جنگ کے محشر کے خوف نے اُس کو کبھی آگے بڑھنے سے باز نہیں رکھا مگر مقدر کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا تھا۔



میں۔ ”توبہ، توبہ، راجپوت پر بزدلی کا الزام کون لگا سکتا ہے۔ مگر ہاں ہم تو اکبر اور پرتاپ کا ذکر کر رہے تھے۔  
 راؤ راجا۔ راجستھان کے تمام راجا ایک ایک کر کے اکبر کی اطاعت قبول کر چکے تھے اور سلطنت کے رکن سمجھے جاتے  
 تھے۔ ان میں صرف رانا پرتاپ اکیلا ایسا تھا جس نے اپنی گردن اکبر کے سامنے نہیں جھکائی۔ چوتھائی صدی تک  
 جنگ و جدل کا محشر برپا رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ صرف ارادلی کی گھاٹیاں اور غار رانا پرتاپ کے لئے قلعوں  
 کا کام دیتے تھے اور جنگل اُس کے محل تھے سونے چاندی کے تھالوں کی جگہ تپوں پر وہ کھانا کھاتا تھا اور نخل کے  
 گدوں اور قالینوں کی جگہ چٹائی اور گھاس پر سوتا تھا اور یہ سب اس لئے کہ اُس نے بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ بابا رادلی  
 کی راجدھانی چتوڑ کو اکبر کے جنگل سے نکال کر آزاد کرے گا۔ ایک دن شاہی دربار میں یہ خبر آئی کہ رانا پرتاپ کے  
 اہل و اطفال بھوکوں مر رہے ہیں اور چونکہ یہ نظارہ اُس سے دیکھا نہیں جاتا وہ اطاعت قبول کرنے کے لئے تیار  
 ہے۔ دربار مغلیہ کے اُن تمام راجپوت راجاؤں کے چہرے جو سلطنت کے رکن اور ستون سمجھے جاتے تھے اس  
 خبر وحشت اثر کو سنتے ہی فق پڑ گئے کیونکہ ان کو رانا پرتاپ کی ذات پر ناز تھا لیکن یہ خبر غلط نکلی۔ رانا پرتاپ آزاد  
 جیا اور آزاد ہی مرا۔ البتہ چتوڑ واپس لینے کی حسرت اُس کے دل میں رہ گئی اور اُس کے ساتھ گئی۔ بالآخر غنیم کی  
 یورش سے مجبور ہو کر اُس کے لڑکے نے ہارمانی اور شہزادہ خرم کے علم فتح و نصرت کے آگے میواڑ کے ارغوانی  
 جھنڈے کو نیچا ہونا پڑا لیکن پھر بھی رانا پرتاپ کا لڑکا وہ دن دیکھنے کے لئے نہ جیا کہ اُس کا شمار بھی اراکین سلطنت  
 مغلیہ میں ہوتا۔

راجا کی آنکھوں کی چمک اب مدہم پڑ گئی تھی۔ اُس کی آواز میں کیفیت سوز و درد تھی ایک لمحہ بعد اس نے کہا:-  
 ”شہزادی۔ رانی پدمنی کے محل کے اُجڑے ہوئے باغ میں آج بھی کونلیں کوکتی ہیں۔ ان کھنڈروں میں اب  
 بھی طوطے اور مینا چپکتے ہیں اور برسات میں مور اپنے پنکھ پھیلائے خوشی خوشی ناچتے ہیں میواڑ کی عورتیں رام اور  
 کرشن۔ مہاویر اور گوری کے مندروں میں آج بھی پھول چڑھانے جاتی ہیں۔ رانا کبھم کے فتح و نصرت کا ستون اب تک  
 آسمان سے باتیں کرتا رہے گویا اسکو چتوڑ کی تباہی کا کچھ بھی حال معلوم نہیں۔ اس کے تلے راجستھان کے بھاٹ  
 آج تک پتا اور جے تل کے گن گاتے اور پتا کی نئی نویلی دھن کی دلیری اور جانا بازی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ وہ  
 شیر دل دھن تھی جو ہاتھ میں تلوار لئے فوج کی سرداری کرنے نکلی تھی اور رن میں سب سے پہلے کام آئی۔ راجپوتوں  
 کے ننگ و ناموس کا یہ کرشمہ تھا کہ عورتیں بھی غنیم کے ہاتھوں میں پڑنا چاہتی تھیں۔ رانی پدمنی کے ساتھ سیکڑوں  
 عورتیں چتا پر چڑھ کرستی ہو گئیں۔ قانون قدرت ہے کہ دنیا میں ہر چیز جو پھلتی پھولتی اور جیتی جاگتی ہے وہ ایک ایک



دن ضائع بھی ضرور ہوتی اور مرجاتی ہے لیکن صرف یوگی اور رشی جنگل اور کھوہ میں سادھ لگائے بیٹھا دھیان اور گیان میں مست رہتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے اس دنیا کے مزخرفات اور کمزوات کا پردہ اٹھ جاتا ہے وہ باور کرنے لگتا ہے کہ دنیا کی وہ سب باتیں جنکے لئے ہم جیتے ہیں ہر طرح کے دکھ سہتے ہیں بلکہ جان بھی دیریتے ہیں مایا اور متھیا ہیں۔ اُس کی آنکھوں کو نور انزل نے اس طرح سے روشن کر دیا ہے کہ اب اسکو سوائے اس کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خواہشات اور نفسانیت پر قابو پا کر صرف اپنے جلوہ روحانیت کے زور سے کائنات قدرت کو اپنا مطیع رکھتا ہے اور سب پر حکومت کرتا ہے۔ وہی ہمارا مالک اور بادشاہ ہے۔ اکبر نے اس اصلیت کو سمجھ لیا تھا۔ اپنے فتوحات کے دوران میں گو اُس نے بعض مندروں کو ڈھا کر مسجدیں بنائیں لیکن بالآخر اُس نے اپنی عبادت گاہ چرخ نیلگوں کے زیر سایہ ہی قائم کی اور ہر کس و ناکس کو مذہب کی آزادی دی۔ گو اُس نے ہم راجپوتوں کو تلوار کے زور سے فتح کیا لیکن ہمارے دلوں پر اپنی حکومت انسانیت اور فراخ دلی سے جمائی۔ اُس نے اپنے دربار میں ہندو کو بھی وہی فضیلت اور مرتبہ دیا جو مسلمان کو۔ گورانا پرتاپ کے دم توڑنے کے ساتھ ہی ساتھ راجپوتوں کی رہی سہی آزادی بھی مٹ گئی لیکن اکبر کے زیر سایہ انھوں نے متحدہ ہند کی عظمت کا خواب دیکھا اور اس معیار کو پیش نظر رکھنا سیکھا۔ ہم نے اگر اپنا پُرانا ورثہ اور ترکہ کھویا تو ایک نئی ملکیت اور دولت بھی معاوضہ میں پائی۔ اور یقین جانئے کہ جب تک خاندان تیمور میں اکبر کے نام لیوا موجود ہیں اور اُس اُلوال العزم ہستی کے نقش قدم اور مسلک سے آپ کے پاؤں نہیں ڈگمگاتے ہم راجپوتوں کا جان و مال آپ پر سے نثار ہے۔ راجپوت صرف تلوار کا دہنی ہوتا ہے اور شہزادی میں اس تلوار کی جو میرے ہاتھ میں ہے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ آپ کے شہزادے دارا کے اور شہنشاہ کے ننگ و ناموس کے لئے ہر وقت و ہر لحظہ کام آئے گی اور میرا جان و مال آپ پر قربان ہو گا رہی ہند کی آزادی سو اس کو بھی ایک نہ ایک دن آتا ہے آج نہ سہی کل، کل نہ سہی پھر کبھی...

• محلوں کی روشنی گل ہو چکی ہے۔ تارے آسمان پر علمگار ہے ہیں، قلعہ کی دیوار کے نیچے دریا بہ رہا ہو میں تن تنہا چبوترے پر بیٹھی ہوں۔ گورادرا جا جا چکا ہے مجھے ہر سو اُسی کی صورت نظر آتی ہے چاروں طرف وہی دکھائی دیتا ہے اسی کی آواز میرے کانوں میں بسی ہوئی ہے اور محبت کا نشہ مجھے سرشار کئے ہوئے ہے میں اپنی جگہ سے اٹھتی ہوں دامن میں پھول چُن چُن کر ڈالتی جاتی ہوں اور پھر بیٹھ کر ایک مالا گوندھتی ہوں۔ میں اس خیال میں مست ہوں کہ گویا میں اپنا سو بھر چانے کی تیاری کر رہی ہوں اور مجھ کو نہ صرف تمام دنیا بلکہ کل



کائنات خوش خوش نظر آتی ہے۔ دیوان عام میں شہزادوں۔ راجاؤں اور سرداروں کا دربار لگا ہوا ہے جس میں شہنشاہ کے پہلو میں تخت طاؤس کے برابر مالا ہاتھ میں لئے بیٹھی ہوں۔ شہنشاہ کا اشارہ پاتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھتی ہوں۔ تمام راجاؤں اور سرداروں پر لاپرواہی سے ایک نظر ڈالتی ہوئی جہاں راؤ راجا اپنی نرالی شان اور ادا سے کھڑا ہوا ہے پہنچتی ہوں اور مسکراتے ہوئے اس کے گلے میں جے مال ڈال دیتی ہوں اور اپنی شادی کے خیال سے مست ہو جاتی ہوں۔ یہ خواب تھا جو اُس رات میں چوتھے پر بیٹھے بیٹھے دیکھا کی۔ فوراً ہی مجھ کو شیخ ابن العربی کا وہ مقولہ یاد آیا کہ جس میں اُس نے بتایا ہے کہ انسان میں اگر قوت ارادی مستحکم و مضبوط ہو تو وہ اپنے خواب و خیال کو اصلیت کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ میں نے فوراً ہی ٹھان لی کہ میں اپنے محبوب کو نامہ شوق لکھوں گی اور اُس کو اپنے راز دل سے ان لفظوں میں آگاہ کروں گی کہ اگر دارا کو اپنے بھائیوں پر فتح ہوئی اور وہ تخت تاج کا مالک ہوا تو پھر اکبر کے اُس قانون و رواج سے جس کی رو سے خاندان مغلیہ کی شہزادیاں زوجیت میں نہیں دی جاتیں۔ قطع نظر کر کے اس پر آمادہ ہو جائے گا کہ وہ اپنی بہن کو شادی کرنے کی اجازت دے اور چونکہ بھائی کو بہن کی خاطر منظور ہے اور بہن کا دباؤ بھائی پر کافی ہے میری شادی اُسی کے ساتھ ہوگی جسکو میں چاہتی ہوں۔

(باقی)

پنڈت شن پرشاد کول

## نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے حسب ذیل قیمت پر معہ محصول مل سکتے ہیں

ستمبر ۲۲ء۔ ۳۔ اکتوبر۔ ۸۔ جنوری ۱۹۳۵ء۔ فروری ۴۔ مارچ ۸۔ اپریل ۸۔ مئی ۸۔ اگست ۸۔ جنوری ۱۹۳۶ء۔  
مئی ۳۔ جون ۳۔ اکتوبر ۳۔ نومبر ۳۔ دسمبر ۸۔ مارچ ۱۹۳۶ء۔ اپریل ۶۔ مئی ۳۔ جون ۳۔ دسمبر ۱۹۳۶ء۔ مارچ ۱۹۳۷ء۔  
مئی ۶۔ ستمبر ۸۔ اکتوبر ۸۔ نومبر ۸۔ جولائی ۱۹۳۷ء۔ اگست ۴۔ ستمبر ۴۔ اکتوبر ۴۔ نومبر ۴۔ دسمبر ۴۔ جنوری ۱۹۳۷ء۔  
فروری ۴۔ مئی ۸۔ جولائی ۶۔ ستمبر ۸۔ اکتوبر ۶۔ دسمبر ۸۔ فروری ۱۹۳۷ء۔ مارچ ۸۔ اپریل ۸۔ مئی ۸۔ جون ۸۔  
جولائی ۸۔ ستمبر ۸۔ اکتوبر ۸۔

۱۹۳۲ء کا پورا فائل بارہ پرچوں کا تین روپیہ میں علاوہ محصول۔ نیچر نگار لکھنؤ



# مصطفیٰ کمال اور ترکی کا انقلاب حکومت

(سلسلہ)

اسی دوران میں بالکل ناگہان طور پر وہ انقلاب رونما ہو گیا جس کے لئے انور سبے اور اس کی جماعت کو شال تھی۔ اس انقلاب کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ نیازی ایک جماعت کو ساتھ لیکر جنوب مقدونیہ میں پہنچا اور حکومت کی مخالفت شروع کر دی۔ اسی کے ساتھ انور نے انقلاب کا اعلان کر کے مشرقی مقدونیہ میں وہی کیا جو نیازی نے کیا تھا۔ مگر نہ کوئی خاص تنظیم تھی، نہ کوئی پروگرام سامنے تھا۔ خود انجمن اتحاد و ترقی اس وقت تین سو آدمیوں سے زیادہ کی جماعت نہ رکھتی تھی اور فوج کے خیالات کا بھی صحیح اندازہ اس وقت تک نہ ہو سکا تھا۔

مصطفیٰ کمال خاموشی سے ان تمام باتوں کو دیکھ رہا تھا اور اپنے فوجی خرائض کے علاوہ کسی اور تحریک میں حصہ نہ لیتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس قسم کی کمزور تدابیر پر کام کرنا جو اکھیلنا ہے اور وہ اس کے لئے طیارہ نہ تھا۔ لیکن اتفاق وقت کہ انور وغیرہ کی یہی کمزور تدابیر کامیاب ہو گئیں۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ جو فوجیں باغیوں کی سرکوبی کیلئے روانہ کی جاتی تھیں وہ خود تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بد دل تھیں اور ان سے جا کر مل جاتی تھیں، فوج پر فوج روانہ ہو رہی تھی اور حکومت کے خلاف انور کی جماعت میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔ پایہ تخت سے خاص اعتماد والی فوج بھی گئی لیکن اس نے بھی یہی کیا۔ جب خلیفہ عبدالحمید نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے فوراً چالاکی سے آئینی حکومت کا اعلان کر دیا اور انقلاب پسندوں کی اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ چنانچہ انور اور نیازی نہایت خوش خوش سالونیکا میں داخل ہوئے اور ترک و عیسائی دونوں جماعتوں نے ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔

سالونیکا پہنچنے کے بعد انور نے اولپس پلیس ہوٹل کے بالا خانہ سے جدید آئین حکومت کا اعلان کیا اور اس وقت مصطفیٰ کمال بھی دوسرے افسران فوج کے ساتھ انجمن اتحاد و ترقی کے ایک معمولی ممبر کی حیثیت سے کسی کونریں کھڑا ہوا تھا۔

اس اعلان کے بعد ہی تمام اکابر ترک جو پہلے بڑی بڑی خدمات پر مامور ہچکے تھے، درمیں سال سے



دوسرے ممالک میں پناہ گزین تھے واپس آنے لگے اور انہوں نے انجمن کے نوجوان کام کرنے والوں کو ہٹا ہٹا کر خود اس پر اپنا قبضہ جمایا اور قسطنطنیہ پہنچ کر حصول اقتدار کے لئے ریشہ دو انیاں کرنے لگے۔ نیازی البانیا چلا گیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا، انور بے، فوجی اٹاچی بنا کر برلن بھیج دیا گیا اور مصطفیٰ کمال شمالی افریقہ روانہ کر دیا گیا تاکہ طرابلس کی فوجوں کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔

اسی آپادھاپی میں سلطان کے ہوا خواہوں کو پھر موقعہ کام کرنے کا مل گیا اور انہوں نے قسطنطنیہ کی فوج کو ملا کر ملاؤں کے ذریعہ سے یہ پروپاگنڈا شروع کر دیا کہ نئی حکومت کے علمبردار یہودی اور فریسیں لوگ ہیں جو اسلام و خلافت کے دشمن اور مذہب یا ترکوں کی جماعت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ قسطنطنیہ کی افواج نے انجمن اتحاد و ترقی سے منحرف ہو کر اپنے افسروں کو گرفتار کر لیا اور خلیفہ کی حمایت کرنے لگے۔

انجمن نے مقدونیہ کی فوج سے مدد طلب کی۔ اس وقت محمود شوکت پاشا یہاں کی فوج کا افسر تھا جو خلیفہ عبد الحمید کا بہت معتمد علیہ افسر تھا۔ اس نے پہلے تو بہت پس و پیش کیا لیکن چونکہ اس کے اسٹاف میں بہت سے افسران ایسے تھے جو انجمن کے ممبر تھے (ان میں مصطفیٰ کمال بھی شامل تھا) اس لئے بادل ناخواستہ مجبوری دخوت کی وجہ سے اس نے مقدونیہ کی فوج کو قسطنطنیہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیدیا۔ رسالہ کی گمان انور بے کے ہاتھ میں تھی اور مصطفیٰ کمال چیف آف اسٹاف تھا۔

انہوں نے قسطنطنیہ پہنچ کر عبد الحمید کو تخت سے اتار دیا اور سالونیکا میں مقید کر کے اس کے بھتیجے کو تخت نشین کر دیا۔ ان تمام کارروائیوں سے انور بے کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور ہر شخص کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگیں۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے یہ دیکھ کر کہ وہ انور بے وغیرہ کے ساتھ کام نہیں کر سکتا اور انجمن اتحاد و ترقی کے بعض اصول و طریق کار سے اس کو اختلاف ہے، اپنی توجہ انقلاب میں عملی حصہ لینے کی طرف سے پھیر لی اور اپنے فوجی فرایض کی طرف پوری طرح مایل ہو گیا چونکہ وہ فطرتاً سپاہی پیدا ہوا تھا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ترقی نہ کرتا، چنانچہ ۳۰ سال کی عمر سے قبل ہی وہ مقدونیہ میں 'چیف آف اسٹاف' بنا دیا گیا۔

۱۹۱۰ء میں جنرل علی رضا کے ساتھ وہ ایک مشن پر فرانس بھیجا گیا اور یہاں سے وہ سالانہ عسکری میں شریک ہونے کے لئے پکار ڈی گیا۔ جنرل علی رضا نے اسکی قابلیت و اہلیت کے متعلق نہایت اچھی رپورٹ کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پس پردہ سالونیکا کے مدرسہ حربیہ کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس نے اسکول کی تنظیم میں نہایت دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہو گئی، لیکن اس کے



عزائم کے لحاظ سے یہ خدمت بہت فروتر تھی اور وہ سیاسیات میں حصہ لیکر صحیح معنی میں ملک کی خدمات انجام دینا چاہتا تھا۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ انور، طلعت اور جمال کا دور دورہ تھا اور باوید وزیر مال تھا۔ مصطفیٰ کمال ان سب نفرت کرتا تھا، جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی حکومت کا اہل نہیں ہے۔ وہ علی الاعلان اپنے ان خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا، چنانچہ ایک دن اس نے پبلک میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ۔ ”جدید حکومت بھی ہمارے درد کا علاج کرنے سے قاصر رہی کیونکہ دول عظمیٰ کی طامعانہ پالیسی ترکی کے متعلق پہلے سے زیادہ سخت ہو گئی ہے، جرمنی نے اپنا دست از ترکی کے حلقوم تک پہنچا دیا ہے، غیر ملکی سرمایہ دار مراعات و حقوق حاصل کرتے جا رہے ہیں باوید نے بغاوت اور یلوے پر غیروں کو قابض بنا دیا ہے، اور ترکی جرمنی کے ہاتھ فروخت کیا جا رہا ہے۔ اندرون ملک کی حالت بدستور اندوہناک ہے، نہ کوئی تنظیم ہے نہ مستحکم اصول سیاست، نہ ملازموں کو تنخواہیں ملتی ہیں نہ رعایا کو روٹی۔ اس لئے جب تک ترک جماعت بغیر بیرونی یا خارجی اثر قبول کئے ہوئے خود حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لے لی یہ بلا دور نہیں ہو سکتی۔“

مصطفیٰ کمال اب سینئر افسر تھا، اسکی قابلیت مسلم ہو چکی تھی، اس لئے افسران نے اس کے خیالات کا اثر قبول کیا اور اس کو مرکزیت سی حاصل ہو گئی۔ ان واقعات کی خبر جب محمود شوکت پاشا کو ملی جو اس وقت قسطنطنیہ میں وزیر حربہ تھا، تو اس نے مصطفیٰ کمال کا تبادلہ سالونیکا کر دیا۔ لیکن یہاں پہونچکر اور زیادہ اقتدار اسے حاصل ہو گیا اور جب انور بے وغیرہ کو معلوم ہوا کہ مصطفیٰ کمال زیادہ خطرناک ہوتا جا رہا ہے تو قسطنطنیہ بلا کر محمود شوکت پاشا نے اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ لیکن چونکہ شہادت کافی نہ تھی اور وہ مصطفیٰ کمال کی طرف سے مطمئن بھی نہ تھا اس لئے سوائے اس کے کوئی اور صورت سمجھ میں نہ آئی کہ سالونیکا سے ہٹا کر اسے پایہ تخت میں رکھا جائے چنانچہ دفتر حربہ میں اس کو مامور کر دیا گیا۔

قسطنطنیہ میں اب تک سکون پیدا نہ ہوا تھا۔ مختلف جماعتیں اپنے اثر و اقتدار کے لئے کوشاں تھیں، ایک جماعت اگر آج برسر اقتدار ہے تو کل دوسری آگئی، پرسوں تیسری نے قبضہ جالیا، اور کوئی ہستی ایسی نہ تھی جو اس اضطراب و انتشار کو دور کر سکے۔ انھیں جماعتوں میں ایک پارٹی جمال کی تھی جو جرمنی کی سخت مخالفت تھی، وہاں کے فوجی معلمین کو نکال دینا چاہتی تھی اور سفیر جرمنی (وانگن ہیم) سے بھی متنفر تھی جو انور کا بڑا دوست تھا۔ مصطفیٰ کمال نے اسی پارٹی سے اپنے تعلقات بڑھائے اور کوشش کی کہ یہ لوگ اس کو اپنا راز دار بنالیں، لیکن چونکہ اپنی



فطرت کے لحاظ سے نہایت آزاد، سخت گیر، صاف گو اور خود سر شخص تھا اس لئے لوگ اس سے خالی رہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے بھنا مشکل ہے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں (اکتوبر ۱۹۱۱ء) میں اٹلی نے بغیر اطلاع کے اپنی فوجیں طرابلس میں اتار دیں اور ساحل کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے شہر پر بھی تسلط قائم کر لیا۔ یہ سنتے ہی مصطفیٰ کمال ملک کے اندرونی سیاسی پیچیدگیوں کو بھول گیا اور اس نے دیکھا کہ یہ وقت اندرون ملک کے مسائل سلجھانے کا نہیں بلکہ دشمن کی مداخلت سے ملک کو بچانے کا ہے اور اس کو جلد سے جلد افریقہ پہنچنا چاہئے۔

اس وقت ترکی اور شمالی افریقہ کے درمیان سلسلہ نقل و حرکت اگر کوئی باقی تھا تو شام و مصر ہو کر کیونکہ اٹلی کی فوجوں نے سمندر پر قبضہ کر کے درہ وانیال کو بند کر دیا تھا۔ پھر ادھر ترکی کی بحری قوت کا یہ حال تھا کہ سوائے دو جہازوں اور چند کروڑ کے اور کچھ تھا نہیں، ان کا بھی یہی حال تھا کہ بڑا لڑنگو خوردہ تھے، بحری سپاہ معدوم تھی اور جہاز شاخ زریں میں پھنسے پڑے تھے۔ اس لئے بحری راستہ سے فوج بھیجنا ممکن نہ تھا۔ مجبوراً خشکی کا راستہ تیار کر لیا گیا۔ انور بے جا چکا تھا اور فتحی بھی جو پیرس میں فوجی اٹاچی تھا براہ مارسل ٹیونس پہنچ چکا تھا۔ مصطفیٰ کمال اپنے دو دوستوں کو ساتھ لیکر براہ خشکی روانہ ہو گیا۔ جہاں ریل تھی وہاں ریل کے ذریعہ سے اور جہاں ریل نہ تھی وہاں گھوڑوں کے ذریعہ سے انھوں نے شام و فلسطین کے راستے طے کئے اور اسکندریہ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ انگریزوں نے مصر کی غیر جانب داری کا اعلان کر کے ٹیونس جانے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ مصطفیٰ کمال یہ سنکر غصہ سے کانپ اٹھا۔ کیونکہ مصر ترکی سلطنت میں شامل تھا اور انگریزوں کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ مصر کی پالیسی کا اعلان کر کے ترکی فوج و ترکی افسران کی راہ میں حائل ہوں۔ لیکن کیا کرتا خون کے سے گھونٹ پیسکر خاموش ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب ساتھ چلنا تو ممکن نہیں ہے۔ سب کو علیحدہ علیحدہ جس طرح ممکن ہو بچنا چاہئے۔

مصطفیٰ کمال عربی لباس پہن کر مغرب کی طرف جانے والی ریل پر بیٹھ گیا۔ جب وہ سرحد پر پہنچا تو وہ روک لیا گیا کیونکہ وہ عربی زبان سے زیادہ واقف تھا اور نہ اس کی صورت و شکل سے عرب نژاد ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ یہاں ایک مصری افسر متعین تھا جس کے پاس مصطفیٰ کمال کا حلیہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ لیکن چونکہ یہ انگریزوں کا دشمن تھا اور ترکوں کا موافق اس لئے اس نے مصطفیٰ کمال سے تو کہہ دیا کہ تم اللہ کا نام لیکر طرابلس جاؤ اور اسی کے بمشکل کسی اور شخص کو گرفتار کر کے اسکندریہ بھیج دیا۔



جس وقت مصطفیٰ اکمال ترکی ہیڈ کوارٹر (عین المنصور میں) پہنچا تو لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی کیونکہ افسران کی بہت کمی تھی اور مصطفیٰ اکمال چونکہ پہلے سے اس سرزمین کا واقعہ الحال تھا اس لئے اس کی خدمات سے کوئی فائدہ ہونے کا اور زیادہ یقین تھا۔ اس کو فوراً میجر بنا کر اس فوج کی کمان دیدی گئی جو ہندو گاہ ڈرنا کے محاذ میں پڑی ہوئی تھی۔ یہیں عین المنصور میں انور بے بھی تھا جو سارے محاذ کا انچارج تھا۔

اٹلی نے اپنی بحری قوت کے زور پر ساحلی مقامات پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اندرون ملک کے اندر وہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ ترکی فوجیں سامنے پڑی ہوئی تھیں اور تمام شمالی افریقہ مسلح تھا کیونکہ جہاد کا اعلان ہو چکا تھا اور تمام افریقی قبائل دور و نزدیک سے ترکوں کی حمایت کے لئے جمع ہو رہے تھے اور انور بہ حیثیت نائب امیر المومنین ہونے کے سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

انور نے ایک بڑا خیمہ نصب کر کے قالین وغیرہ سے اُسے آراستہ کر دیا تھا اور یہیں وہ شیوخ قبائل سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس نے ہر قبیلہ کے لئے چالیس چالیس خیمے علیہ کردئے تھے اور ہر خیمہ کے لئے ایک عورت کھانا پکانے کے لئے مقرر کر دی تھی اور ہر قبیلہ کی فوج کے لئے تین ترک افسر مقرر کر دئے تھے اور ساری فوج اطمینان سے کام کر رہی تھی۔

مصطفیٰ اکمال، فوجی عہدہ کے لحاظ سے انور کا ماتحت تھا اور اکثر دونوں کو ملنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن اتحاد رائے ان دونوں میں کبھی نہیں ہوا۔ دونوں کی رگوں میں البانیہ کا آزاد و جنگجو خون دوڑ رہا تھا، دونوں خود سر خود رائے بڑا اور جبری تھے، نہ یہ نکتہ چینی کو برداشت کر سکتا تھا نہ وہ — فرق اگر تھا تو صرف یہ کہ انور صرف اپنے بلند غریم کی پرورش کرتا تھا اور تدابیر کی تفصیل اور ان کے قابل عمل ہونے پر چنداں توجہ نہ کرتا تھا، لیکن مصطفیٰ اکمال کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہتا تھا کہ وہ پورا بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ وہ واقعات و حالات کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ کس کام کو کس طریقہ سے انجام دینا چاہئے۔ چنانچہ جب وہ سالونیکا میں تھا، اسی وقت وہ انور سے نفرت کرنے لگا تھا اور یہ جذبہ روز بروز شدید ہوتا جاتا تھا۔ ان دونوں میں بار بار سخت کلامی کی بھی نوبت آگئی لیکن فتحی نے ہمیشہ بیچ بچاؤ کر دیا۔ یہاں بھی ان دونوں کی مخالفت و مغایرت کی یہی کیفیت تھی اور مصطفیٰ اکمال نہ اس کی دعوتوں میں کبھی شریک ہوتا تھا اور نہ اس کے دربار میں۔ وہ الگ ایک چھوٹے سے خیمہ میں پڑا ہوا اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھا اور انور کے اس اقتدار و مرکزیت کو دیکھ دیکھ کر جل رہا تھا۔

جنگ طرابلس تقریباً ایک سال تک جاری رہی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، نہ ترک اٹلی کو ساحلی مقامات سے ہٹا سکے



اور نہ آئی اندرون ملک میں ایک انچ آگے بڑھ سکا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں (اکتوبر ۱۹۱۸ء) ماسکو نے اعلان جنگ کر دیا اور بلقان کی تمام عیسائی ریاستیں متفقہ قوت سے ترکی کے مقابلہ میں آگئیں۔ اس حادثہ نے ترکی کو مجبور کر دیا کہ وہ آئی سے صلح کر لے اور تمام ترکی فوجوں کو اس نئی سیبیت کا مقابلہ کرنے کے لئے افریقہ سے واپس بلا لے۔ چنانچہ کمال بھی فوراً واپس گیا۔ لیکن چونکہ سیدھا راستہ بند تھا اس لئے وہ آسٹریا، رومانیہ اور بحر اسود ہوتا ہوا روانہ ہوا اور دسمبر کے پہلے ہفتہ سے قبل نہ پہنچ سکا۔ اس وقت یہاں کی حالت حد درجہ اضطراب و انتشار کی تھی۔ ترکی فوجیں تقریباً سب کی سب تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ سردیاں شمال سے بڑھتا آرہا تھا، یونان نے جنوب کی طرف سے بڑھ کر سالونیکا پر قبضہ کر لیا تھا اور ۲۵ ہزار ترکی قیدی اس کے پاس تھے، بلغاریہ سیدھا قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور شتلی پر جو قسطنطنیہ سے ۱۵ میل کے فاصلہ پر ہے اپنا محاذ قائم کئے ہوئے تھا۔ الغرض پائے تخت کے ارد گرد چند میل زمین اور آرناس کے علاوہ جسکا محاصرہ بلغاریہ نے کر رکھا تھا تمام یورپین ترکی ہاتھ سے نکل چکا تھا اور ان تمام تباہیوں میں اگر کوئی امید لگی ہوئی تھی تو روت سے جو حمیدیہ کر و زر کو لے ہوئے بحیرہ ایجن میں ادھر ادھر دشمنوں کے بندرگاہوں یا ذخائر پر چھاپے مارتا پھرتا تھا۔

قسطنطنیہ زخمیوں سے بھرا ہوا تھا، اسپتال، کلیسا، مسجدیں، خانگی مکانات، ہوٹل، قہوہ خانے الغرض ہر جگہ زخمی ہی زخمی نظر آتے تھے اور ان کو غذا تک پہنچانا دشوار تھا۔ اسی زمانہ میں ہیضہ بخار بھی پھیل گیا جس نے اور شہر آؤ کر دیا۔ پھر حکومت کی حالت یہ تھی کہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے اقتدار کی فکر میں لگی ہوئی تھیں اور کوئی ایسی مرکزی ہستی موجود نہ تھی جو اس انتشار کو دور کر سکے۔

مصطفیٰ کمال نے قسطنطنیہ پہنچ کر سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ سالونیکا میں اسکے خاندان پر کیا گزری۔ کیونکہ یونانیوں نے وہاں نہایت بیدردانہ غارتگری کی تھی۔ بہت جستجو کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں اور بہن (مقبولہ) دونوں یہیں قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہیں، چنانچہ تلاش کر کے وہ ان سے ملا اور کیمپ سے اٹھا کر شہر لے آیا۔ اسکے بعد اس نے دفتر حربیہ میں حاضری دی اور گیلی پولی میں چیف آف اسٹاف کی حیثیت سے اس کو مامور کیا گیا۔ اس وقت گیلی پولی میں ترکوں کی ایک فوج بلیر کے مقام پر بلغاریوں کے مقابلہ میں پڑی ہوئی تھی اور یہ ایسا اہم و نازک مقام تھا کہ اگر بلغاریہ کی فوجیں اس سے عبور کر جاتیں تو درہ دانیال اور تمام ایشیا کوچک ترکوں کے ہاتھ سے نکل جاتا۔



مصطفیٰ کمال یہاں پہنچا ہی تھا کہ دشمن نے قلعہ بلیر پر حملہ شروع کر دیا۔ قلعہ کی حالت یہ تھی کہ ۵۰ سال قبل جو استحکامات انگریزی انجنیروں نے جنگ کریمیا کے موقعہ پر تیار کئے تھے وہی خراب و خستہ حالت میں پائے جاتے تھے اور ترکی فوج انہیں سے کام لے رہی تھی۔

مصطفیٰ کمال کے پہنچ جانے سے ترکی افواج میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی اور بلغاریہ کے حملوں کا جواب انہوں نے نہایت پامردی سے دیا، لیکن قبل اس کے کہ شکست و فتح کا فیصلہ ہوتا، دولِ عظمیٰ نے صلح کانفرس طلب کر لی اور ریاستہائے بلقان نے اپنا یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ سوائے قسطنطنیہ تمام حصہ یورپین ترکی کا انہیں تقسیم ہونا چاہئے اور اڈریانوپل فوراً بلغاریہ کے حوالہ کر دیا جائے جس کا وہ محاصرہ کئے ہوئے تھا۔

ترکوں کی حالت اس وقت یہ تھی کہ ان میں مختلف جماعتیں کام کر رہی تھیں، ایک جماعت جو وزیرِ کامل پاشا کے ہاتھ میں تھی صلح چاہتی تھی خواہ وہ کتنی ہی ذلیل شرائط پر کیوں نہ ہو اور نوجوان جماعت اس کی مخالف تھی۔ اسی دوران میں انور بے، طرابلس سے واپس آیا اور فوراً انجمن اتحاد و ترقی کا جلسہ طلب کر کے نوجوان افسروں کی ایک جماعت ساتھ لی اور دربارِ خلافت میں داخل ہو کر مجلسِ وزراء کو درہم و برہم کر دینا چاہا۔ جس وقت انور بے اندر داخل ہونے لگا تو ناظم پاشا وزیرِ حربیہ نے اسے روکا، اس نے ریوالونکالکر ناظم پاشا کو اسی جگہ ڈھیر کر دیا اور دوسرے وزراء کا بھی تعاقب کر کے باہر نکال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجلسِ وزراء پر نوجوانوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور محمود شوکت کو وزیرِ اعظم بنا کر طلعت اور جمال کو کابینہ وزارت کا ممبر بنادیا گیا۔

ہر چند اس انقلاب سے بعض حلقوں میں بے چینی پیدا ہو گئی اور بعض گوشوں سے علانیہ مخالفت کی آواز بلند کی گئی، لیکن انور بے نے سختی سے کام لیکر اس اختلاف کو دور کیا اور بعض زیادہ خود سر لوگوں کو دار پر چڑھا کر اپنا سکہ بٹھا کر چھوڑا۔

اس کے بعد انور بے کو سب سے بڑی فکر اس امر کی تھی کہ اڈریانوپل کو بلغاریوں کے ہاتھ سے کیونکر بچایا جائے چنانچہ اس نے یہ تدبیر سوچی کہ شاخِ زریں سے ایک بیڑہ روانہ کیا جائے جو بمقام شاہ کوئی فوجیں اتار کر بلیر کے جنوب سے دشمن پر حملہ کرے اور دوسری طرف سے بلیر کی فوجیں آگے بڑھیں، اس طرح شتلبہ کے محاذ سے دشمن ہٹ جائے گا اور نہ بچ جائے گا۔

اس کانفرس میں مصطفیٰ کمال بھی شریک تھا۔ اس نے کہا کہ شاہ کوئی کی پہاڑیوں پر دشمن قابض ہے اس لئے وہاں فوجیں اتارنا خطرہ سے خالی نہیں اور بلیر کی فوج بھی دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اس لئے



یہ تدبیر ناقابل عمل ہے اور سوائے نقصان کے فائدہ کی کوئی توقع نہیں۔

انور سبے یہ نکتہ چینی شکر بگڑ گیا اور آخر کار اسی کی تجویز پاس ہو گئی۔ ۸۔ فروری کو بکسیر کی افواج نے حملہ کیا جس میں مصطفیٰ اکمال بھی شریک تھا۔ چند میل جانے کے بعد گہرنے ان کے اقدام کو روک دیا اور بلغاریوں نے بائیں طرف سے توپوں کی بارش مارنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں کی نصف فوج ہلاک ہو گئی اور مصطفیٰ اکمال کو واپس ہونا پڑا۔ شاہ کوئی کی طرف سے جس ترکی فوج نے حملہ کیا تھا اس کو بھی پسپا ہونا پڑا اور چھ ہزار سپاہی اس میں بھی کام آئے۔

الغرض ایک ماہ بعد اور نہ ہاتھ سے نکل گیا اور انور کو مجبوراً انھیں شرائط صلح پر دستخط کرنا پڑے جو مقتول کامل پاشا نے منظور کر لئے تھے۔ لیکن حسن اتفاق سے اسی وقت خود ریاستہائے بلقان میں باہد گر جنگ شروع ہو گئی اور انور سبے نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پھر اور نہ پر چڑھائی کر دی اور ترکی جھنڈا انصب کر دیا۔

(باقی)

## سرمہ۔ کاجل۔ چورن۔ منجن

ادبیر صاحب نگار خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اب سے بہت قبل ظاہر کر چکے ہیں۔ کاجل۔ آشوب سرخی وضعف بصارت کے لئے از بس مفید ہے ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہو قیمت سرمہ۔ یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں ممیرہ نہیں ہے بلکہ معمولی سرمہ ہے جس کو جڑی بوٹیوں کے عرق میں پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا دھند موتیا بند اور ضعف بصارت صحت ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بار بار آزمایا ہوا ہے۔ قیمت فی پڑیہ ۷ علاوہ محصول۔

چورن۔ یہ وہ اکسیر چیز ہے جس کا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔ پیٹ کا درد قبض، نفخ، ریاخ کا پیدا ہونا، سوز، ہضم، دستوں کا آنا سب یک نخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے۔ کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک منگلی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ آٹھ تولہ علاوہ محصول۔ منجن۔ اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ آٹھ تولہ علاوہ محصول۔ نوٹ:۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

پتہ:۔ م۔ بیگم ذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ



# باب الانتقاد

## جناب سیاب اکبر آبادی کا مجموعہ منظومات

(یہ سلسلہ ماہ گزشتہ)

صفحہ ۲ پر، لیکن روسی کو مخاطب کر کے انھوں نے ایک شعر لکھا ہے:-

بیگسی کے زرد چہرہ پر خوشی کا نور سمیتا      افسر شاہی بساطِ محفلِ مزدور سمیتا

افسر تاج کو کہتے ہیں اور تاج کو (بساط) کہنا غلط تعبیر ہے۔ (بساط) میں بسط یا پھیلاؤ کا مفہوم نہیں ہے اسلئے (افسر) کو بساط کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

صفحہ ۳ پر فردوس گم شدہ کی نظم میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ہے صدائے دشنہ و نشتر سرورِ ارتقا      موت کی سرچنج ہے اسکے لئے آوازِ چنگ

مکن ہے دشنہ کے استعمال کے وقت کوئی آواز پیدا ہوتی ہو، لیکن نشتر کے ساتھ لفظ (صداء) کا استعمال بالکل بے محل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ لفظ (صداء) بمعنی (طلب) لایا گیا ہے تو پھر دوسرے مصرعہ کے ساتھ اس کا توازن باقی نہیں رہتا کیونکہ اس میں (آوازِ چنگ) آواز ہی کے معنی میں ہے۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ میں بھی (اس کے لئے) کی تکرار ضروری تھی۔

اسی نظم کا دوسرا بند شاعر نے اس دعوے کے ساتھ شروع کیا ہے کہ

عالم ایجاد اک مجموعہ تضاد ہے      اختلاف رنگ و بو سے انجمن آباد ہے

حالانکہ اختلاف رنگ و بو تضاد نہیں، بلکہ تنوع ہے۔

اس کے بعد اس تضاد کی صراحت کی ہے کہ:-

باغ میں لالہ بھی ہے، گل بھی سمن بھی خار بھی      ایک رنگیں خامشی مہربا فریاد ہے

ضد نہیں آپس میں ان کو باوجود اختلاف      جانتے ہیں سب نظام دہر بے بنیاد ہے



پہلے شعر میں لالہ گل و سمن میں باہم دگر کوئی تضاد نہیں۔ اگر تضاد ہے تو صرف گل و خار میں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے لالہ گل اور سمن لائے گئے در نہ یوں ان کی ضرورت نہ تھی۔ یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا،

ایک ہی گلبن سے پیدا پھول بھی ہیں خار بھی

دوسرے مصرعہ میں (رنگین خامشی) کا فقرہ لالہ و گل وغیرہ کے لئے تو لاسکتے ہیں لیکن (خار) کی خامشی میں تو کوئی رنگینی نہیں ہے۔ علاوہ اس کے ٹہر لب فریاد کہنے سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا کہ اُن میں واقعی کوئی احساس تضاد کا نہیں ہے بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ فریاد تو کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :-

رکھ لئے ہیں نام پھولوں کے ہمیں نے مختلف فطرت گلشن مگر اس قید سے آزاد ہے

اس شعر نے اُس دعویٰ کو بالکل رد کر دیا جو شاعر نے پہلے شعر میں کیا تھا کہ ”عالم ایجاد اک مجموعہ تضاد ہے“۔  
نظم کہنے میں شعراء کی ناکامی کا اکثر سبب یہی ہوا کرتا ہے کہ وہ خود اپنے قول کے تضاد کو محسوس نہیں کرتے اور اس طرح پوری نظم غیر مربوط و غیر متوازن اشعار کا مجموعہ ہو جایا کرتی ہے۔ صفحہ ۳۶ پر آزادی کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے :-

وہ اک جو مجھ سے صبر بہار و صدمہ چین در بر نشاط دو جہاں مدد دل حیات انجمن در بر

(صدمہ بہار در بر) اور (صدمہ چین در بر) علیحدہ علیحدہ تو ٹھیک ہے لیکن دونوں کو ملا کر (در بر) سے ترکیب دینا مناسب نہیں علاوہ اس کے جب (صدمہ بہار در بر) کہہ دیا تو پھر (صدمہ چین در بر) یوں بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ یہ تو تنزل ہوا نہ کہ ارتقا۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ (در دل) بھی کھٹکتا ہے، کیونکہ (در بر) کی رعایت سے یہاں بھی کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو کسی محسوس شے کو ظاہر کرتا ہو اور اس لئے اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا۔

نویں خرمی بر لب فرود غ انجمن در بر

اس نظم کا دوسرا شعر یہ ہے :-

سیاہ دست لمبے بال پیچ و خم سے بیگانہ نشیلی انکھڑیاں لیکن مذاقِ رم سے بیگانہ

پہلے مصرعہ میں (سیاہ دست لمبے بال) کی نشست الفاظ کانوں کو بُری معلوم ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے تھے (وہ لمبے لمبے بال) یا (وہ کالے کالے لمبے بال)۔ علاوہ اس کے (پیچ و خم سے بیگانہ) ہونا بالوں کا کوئی حسن نہیں ہے۔ شاعر کا اصل مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ اپنے بالوں میں کسی کو پھنسا کر ہلاک نہیں کرتی اور اسی لئے (پیچ و خم)



سے اُن کو میگا نہ ظاہر کیا گیا، لیکن یہ غور نہ کیا کہ ان الفاظ سے مفہوم میں جو تغیر پیدا ہو جاتا ہے وہ اس (حور مجسم) کی تکمیل حُسن کے منافی ہے۔ اسی نظم کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو:-

خلش گل کی جگر میں اور دل میں درد لالہ کا ادھر اک ہاتھ میں مسجد، ادھر گنبد شوالے کا  
(دل میں درد لالے کا) تو خیر لالہ کے داغدار ہونے کی وجہ سے ٹھیک ہے لیکن (خلش گل کی جگر میں) کیوں ہو۔  
دوسرے مصرعہ میں عجیب بات یہ ہے کہ ہاتھ میں مسجد تو پوری دکھادی گئی لیکن شوالہ کا صرت گنبد۔ ہر چند جزو بول کے کل مراد لینا نا درست نہیں، لیکن مسجد کا ذکر بھی اسی انداز سے کرنا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے مصرعہ کی ترکیب کا تقاضہ یہ تھا کہ مفہوم یوں ظاہر کیا جاتا۔ ادھر اک ہاتھ میں مسجد ادھر دوسرے ہاتھ میں شوالہ۔ لیکن دوسرے ہاتھ کی صراحت کہیں نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعر کا مقصود یہ بتانا ہے کہ ایک ہی ہاتھ میں مسجد و شوالہ دونوں ہیں تو پھر (ادھر اور ادھر) کی صراحت کوئی معنی نہیں رکھتی۔  
اس کے بعد کا شعر ہے:-

زبان پر نغمہ ناقوس سے تنویر کی موجیں لبِ خود رنگ پر چلی ہوئی تکبیر کی موجیں  
ناقوس سے کوئی نغمہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف آواز یا صدا پیدا ہوتی ہے، علاوہ اس کے (زبان پر تنویر کی موجیں) کہنا بھی درست نہیں، کیونکہ (تنویر) اور (موجیں) دونوں کا اقتضایہ ہے کہ اُن کا وجود کسی نمایاں اور کھلی ہوئی جگہ پر ظاہر کیا جائے نہ کہ زبان پر جو منہ کے اندر چھپی ہوئی رہتی ہے۔  
دوسرے مصرعہ میں لفظ (خود رنگ) کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی سوائے اس کے کہ مصرعہ پورا کرنا تھا۔

اور ایک شعر اسی نظم کا ملاحظہ ہو:-

ہمالہ کی پری اور طور کا اک جلوہ رعنا جو اسکی اک نظر زمزم تو اسکی اک نظر گنگا  
اس شعر میں سیما صاحب نے لفظ و نشر غیر مرتب پیدا کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ گنگا کا تعلق ہمالہ سے ضرور ہے، لیکن طور سے زمزم کا کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ اس کے زمزم نام کنویں کا ہے اور محض زمزم بول کر اُس کا پانی کبھی مراد نہیں لیا جاتا۔ میری رائے میں اس شعر کو یوں ہونا چاہئے:-

ہمالہ کی پری اور نجد کا اک جلوہ رعنا جیسے پر آب زمزم اور بالوں میں لئے گنگا  
صرف ہمالہ (پہاڑ) کی رعایت بلکہ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے لحاظ سے بھی (گنگا) کا تعلق بالوں سے زیادہ ہے۔



فضا کی وسعتوں میں اڑنے والی اک رداس پر ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پر  
 معلوم نہیں آزادی کی پری دفعۃً رد کیونکر ہو گئی۔ (اک رداس پر لئے ہوئے ہے) ہونا چاہئے تھا۔ دوسرے  
 مصرعہ میں غالباً اسی رد کو (ادائیں) کہا گیا ہے جو درست نہیں علاوہ اس کے اداؤں کا تیرنا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔  
 تنفس میں نجات اُسکے، ترنم میں حیات اُسکے تکلم گلستاں اس کا جلو میں کائنات اُسکے  
 دوسرے مصرعہ میں (گلستاں) کی رعایت سے بجائے (تکلم) کے (تبسم) لکھنا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے (کائنات)  
 کی جگہ کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو نجات و حیات کی قبیل سے ہوتا۔ یہ شعریوں کو دیا جائے تو غالباً کوئی نقص  
 باقی نہ رہے۔

تکلم میں نشاط اُسکے ترنم میں نجات اُسکے تبسم گلستاں اس کا تنفس میں حیات اُسکے  
 اس کے بعد کا شعر ہے :-

سکوں برسسا ہوا اس کے تبسم سے محبت کا شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا  
 پہلے مصرعہ میں (برسا ہوا) بجائے (برستا ہوا) کے استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں (تیوروں) جمع  
 استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ (تیور) میں خود جمع کا مفہوم ہے اور اساتذہ نے ہمیشہ اس کو جمع کے مفہوم میں  
 استعمال کیا ہے۔ داغ کا شعر ہے :-

غیر کے آتے ہی وہ تیور نہ تھے تم کو انھیں باتوں نے رسوا کیا  
 علاوہ اس کے تیور ہمیشہ خشونت و برہمی وغیرہ کے محل پر استعمال ہوتا ہے اور شگفتگی سے اُسے کوئی واسطہ  
 نہیں۔ یہ شعریوں ہونا چاہئے :-

برستا تھا سکوں اس کے تبسم سے محبت کا جبین صاف پر تھا موجزن دریا صداقت کا  
 شعاع حسن لرزاں اسکے فردوسی اشاروں میں بہار افرور پھولوں میں صباحت زیر تاروں میں  
 دوسرا مصرعہ پہلے سے بالکل علیحدہ ہے۔ کچھ تپہ نہیں چلتا کہ بہار افرور پھولوں اور صباحت زیر تاروں میں کیا  
 چیز تھی۔ اگر کہا جائے کہ دوسرا مصرعہ بدل واقع ہوا ہے فردوسی اشاروں کا تو مناسب یہ تھا کہ لفظ یعنی سے  
 اس کی وضاحت کر دیجاتی۔

علاوہ اس کے بجائے (لرزاں) کے اگر (نہاں) لکھا جاتا تو زیادہ بر محل ہوتا۔  
 شگفت لالہ گل اور اپنا سینہ پر غم صفحہ ۵۸ -



فارسی میں لفظ (شگفت) تعجب و حیرت کے معنی میں آتا ہے اور اس کا تلفظ (شگفت) بہ کسر (شین) ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے لئے فارسی میں (شگفتگی) کا لفظ مخصوص ہے۔

صفحہ ۲۰۸ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان چراغ ساحل ہے اور جو چتا کی آگ کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کا دوسرا شعر ہے  
اک جہنم تش افساں ہے سر مرکز آب ایک آتش کدہ لرزاں نظر آتا ہے مجھے  
حالانکہ چراغ ساحل یا چتا کے شعلا کو جو ہمیشہ ساحل پر نظر آتا ہے، (مرکز آب) سے کوئی تعلق نہیں۔

صفحہ ۲۰۹۔

لفظ (تنقید) غلط ہے۔ عربی میں نقد و انتقاد تو آتا ہے لیکن باب تفعیل میں لا کر (تنقید) کبھی استعمال نہیں کرتے۔  
صفحہ ۲۱۵:-  
سینہ گل چاک ہے، غنچہ کے دل میں تیر ہے

معلوم نہیں غنچہ میں وہ کیا چیز ہے جسے سیما صاحب نے (تیر) سے تعبیر کیا ہے۔

صفحہ ۲۰۵۔

دل بر آتش، جاں بلب ہموں داسر جاتا ہوں میں

(دل در آتش) چاہئے۔

صفحہ ۱۹۹۔

سینے میں اب تک روشن چراغاں

چراغاں کے ساتھ لفظ (روشن) مستعمل نہیں ہے۔ چراغاں کردن، چراغاں شدن وغیرہ تو لاتے ہیں لیکن چراغاں روشن کردن خلاف محاورہ ہے اردو فارسی میں کہیں نہیں دیکھا گیا یوں ہونا چاہئے تھا:۔ سینہ ہر اب تک لیکن چراغاں  
صفحہ ۱۹۰۔ غالب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں

اے کہ تو را ز بقا اندر فنا فہمیدہ ہے

یہ مصرعہ غالباً غالب کی دشوار پسند طبیعت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے اور شاید اس کاوش کے ساتھ کہ مفہوم سے بیگانہ رہے۔ لفظ فہمیدہ اور اس کے موجودہ صورت استعمال کے متعلق میں کیا عرض کروں، سیما صاحب کو خود غور کرنا چاہئے۔

صفحہ ۷۷، پر صورت ہجرت کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت پاکیزہ نظم ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کا رخ زیبا بھی بدناخال سے خالی نہیں۔ اس کا ایک شعر ہے:-

ہجرت اک تمہید ہے وصل دل مہجور کی ہجرت اک تجدید و عزم طلب دستور کی

پہلے مصرعہ میں وصل دل بجائے تسکین دل کے استعمال ہوا ہے۔ لفظ وصل ہمیشہ اس چیز کے ساتھ مرکب ہوتا ہے



جو مطلوب ہوتی ہے اور اسی لئے وصلِ دوست، وصلِ حبیب وغیرہ کی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں مطلوب (دلِ مہجور) نہیں ہے بلکہ اس کا سکون مطلوب ہے اور اس لئے (وصلِ دلِ مہجور) کی ترکیب نا درست ہے۔  
دوسرے مصرعہ میں (عزمِ طلب و ستور) میں ترکیب اضافی ہے اور لفظ (طلب) کو کسور ہونا چاہئے ورنہ ایک اس کا آخری حرف یعنی (ب) ساکن پڑھا جاتا ہے۔

صفحہ ۸۲ پر ایک نظم شہید کے عنوان سے درج ہے۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو:-

حد معلومہ ہستی سے گزرتا ہی نہیں      صرف اک یہ ہے وہ انسان جو مہرما ہی نہیں

پہلے مصرعہ میں لفظ معلومہ صفت ہے فقط (حد) کی، حالانکہ (حد) عربی میں مذکر ہے اور اس کی صفت (معلوم) ہونا چاہئے نہ کہ (معلومہ) جو مؤنث ہے۔ اس میں شک نہیں کہ (حد) اردو میں مؤنث ہے لیکن ترکیب توصیفی میں اسکی صفت تو ہمیشہ مذکر لائی جائے گی۔

صفحہ ۸۴ پر منافق کے عنوان سے ایک نظم نظر آتی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

منافق جس کو مار آستیں کہتے ہیں دنیا میں      وہ ہے اک خطرہ خاموش آغوشِ تماشائیں

دوسرے مصرعہ میں (آغوشِ تاشا) کا کوئی تعلق شعر کے مفہوم سے ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر بجائے (تاشا) کے (تمنا) کہا جاتا تو خیر یک گونہ ربط پیدا ہو سکتا تھا۔

اسی نظم کا دوسرا شعر ہے:-

لہو پیتا ہے بنکر سانپ، اخلاص و محبت کا      وہ ڈاکو ہے، وہ غارتگر ہے انسانی شرافت کا

سانپ کا کام لہو پینا نہیں ہے بلکہ ڈسکر علیحدہ ہو جانا ہے، البتہ اگر بجائے سانپ کے (جونک) کہا جاتا تو لہو پینا ٹھیک ہو سکتا تھا۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

وہ اک تنور ہے جس پر سپیدی ہو سکوں افشاں      وہ اک نبوہ ہے جو ہے غلافِ رنگ میں نہاں

اول تو یہ ضروری نہیں کہ ہر تنور پر سپیدی نظر آئے اور اگر اسے تسلیم کر لیں تو بھی اس سپیدی کا (سکوں افشاں) ہونا عجیب بات ہے۔

نقص تعبیر و معنی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:-

دل اس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہوزباں اسکی      کثافت سے ہیں آلودہ خیال آریاں اسکی

زباں پر کچھ ہے دل میں کچھ، نمونہ ہر دورنگی کا      خود اس کا ہر عمل شاہد ہو اسکی ظرفِ تنگی کا



صرف ان دو شعروں بلکہ پوری نظم میں منافق کی تصویر کھینچ کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہے اور جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں ہے۔ لیکن اس مصرعہ میں

دل اس کا مزبلہ ہے اور گندہ ہے زباں اُسکی

بیان کا یہ التزام قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ یہاں دل و زبان دونوں کو گندہ دکھایا۔ اگر اس مفہوم کو یوں ادا کیا جاتا کہ۔  
”گو زباں بظاہر صاف ہے لیکن دل اس کا مزبلہ ہے“ تو بیشک درست ہو سکتا تھا علاوہ اس کے زباں اور آرائیاں ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

دوسرے شعر میں (ظرف تنگی) کی ترکیب بجائے (تنگ ظرفی) کے استعمال کی گئی ہے۔ فارسی میں یونٹو (ظرف تنگ) لکھتے ہیں لیکن جب یائے مصدری کا اضافہ کر کے اسم معنی بنائیں گے تو موصوف و صفت کو الٹ کر علامت صفت یعنی (کسرہ) کو غائب کر دیں گے اور اسی لئے وہ (نازک بدنی) کہیں گے، (بدن نازکی) کبھی استعمال نہ کریں گے۔ (کم ظرفی، تنگ ظرفی) کہیں گے اور (ظرف کمی، ظرف تنگی) کبھی نہ بولیں گے۔ (کو تاہ آستینی) استعمال کریں گے اور (آستین کوتاہی) کبھی نہ لکھیں گے اور دو میں اس قاعدہ کے خلاف صرف ایک لفظ (دست درازی) کا استعمال ہوتا ہے، لیکن فصحا ہمیشہ (دراز دستی) لکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک استاد کہتا ہے:-

مطلق پتہ ملا نہ گریبانِ صبح کا  
کیسی دراز دستی شبہائے تار ہے

خود سیما صاحب نے اسی مجموعہ میں ایک جگہ لکھا ہے:-

پیش آلودہ حسرت سے برہم خاطری کیسی

حالانکہ (ظرف تنگی) پر قیاس کر کے انھیں (خاطر برہمی) لکھنا چاہئے تھا۔

صفحہ ۱۰۳ پر ایک نظم ”دعوت غور و فکر“ کے عنوان سے درج اور اچھی نظم ہے لیکن اسی نوع کے نقالیص اس میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا دوسرا شعر ہے:-

تغیرات اور علی التواتر تصرفات اور بے محابا  
کمال حسن و جمال کیا ہو، زوالِ شیبِ شباب کیا ہو

پہلے مصرعہ میں اگر بجائے (تصرفات) کے (تحولات) ہوتا تو اصطلاحی رنگ پیدا ہو جاتا۔ دوسرے مصرعہ میں (زوالِ شیب و شباب) لکھا گیا ہے، درانحالیکہ شیب خود زوال کی صورت ہے، زوالِ شباب تو ٹھیک ہے لیکن زوالِ شیب کے معنی تو پھر از سر نو جوان ہو جانے کے ہیں۔ اسی نظم کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

یہ نغمے کیوں حشر سامعہ ہیں، خمار کیوں مالِ مستی  
سرود میں یہ صدا ہو کیسی نولے چنگِ رباب کیا ہو



(حشر) کے معنی گروہ اندر گروہ جمع ہونے اور اکٹھا ہونے کے ہیں۔ اور سیلاب صاحب کی مراد یہاں سامعہ کی بیداری ہے یا اس کا لطف اندوز ہونا اس لئے بجائے (حشر) کے (نشر) استعمال ہونا چاہئے یا (لطف) اسی نظم کا ایک شعر اور ہے :-

یہ کیوں درخشنده ہیں کواکب یہ آسماں کیوں گردِ ثنویں ہر مہر میں التہاب کیسا، یہ نرہت ماہتاب کیا ہے پہلے مصرعہ میں بجائے (گردش) کے (گردشوں) استعمال کیا گیا ہے۔ یوں بھی لکھ سکتے تھے :-  
یہ کیوں درخشنده ہیں کواکب، فلک ہر گردش میں رات دن کیوں

دوسرے مصرعہ میں (التہاب) کی رعایت سے بجائے (یہ نرہت ماہتاب) کے (بردوت ماہتاب) ہونا چاہئے اس طرح لفظ (یہ) بھی نکل جاتا جو بے ضرورت استعمال ہوا ہے۔

صفحہ ۱۰۵ - ایک نظم ”طور کی چوٹی پر“ لکھی گئی ہے اور خوب ہے، لیکن بے اعتدالیاں ایمل بھی کہیں پانی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :-

لگانا چاہتا ہوں سارے کوہ طور کا سرمہ  
یہاں لفظ (سارے) بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ بجائے اس کے (خاک) بھی لکھ سکتے تھے۔  
دوسرے بند کا پہلا شعر ہے :-

کلیسا میں تجھے ڈھونڈا حرم میں بھی تجھے ڈھونڈا برہمن بنکے برہیت لہنم میں بھی تجھے ڈھونڈا  
دوسرے مصرعہ میں لفظ (سہر) اور (بھی) کا اجتماع درست نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا تھا :-  
برہمن بنکے، ہاں، بیت لہنم میں بھی تجھے ڈھونڈا  
اسی بند کا ایک شعر ہے :-

دفور جستجو نے کر دیا اس درجہ کا ہیدہ کہ واماں نسیم صبح دم میں بھی تجھے ڈھونڈا  
لفظ (کاہیدہ) کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ دفور جستجو سے کاہیدگی تو پیدا ہو سکتی ہے، لیکن واماں نسیم کی جستجو کے لئے (کاہیدگی) ضروری نہیں۔ غالباً سیلاب صاحب کا مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ کاہیدہ ہو کر (تنگہ) بن گئے اور پھر ہوا کے ساتھ ساتھ اڑتے پھرے لیکن افسوس ہے کہ وہ الفاظ سے اس کو ادا نہ کر سکے۔  
تیسرے بند کا ایک شعر ہے :-

زمانہ ہو چکا پھر طور کا ماحول خالی ہے  
فضائے شوق میں خاکستر قلب و جگر گردے



پہلے مصرعہ میں لفظ (بھر) بالکل بیکار ہے، اور (ماحول) کا خالی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بجائے (خالی) کے (افسردہ) لکھنا چاہئے۔

دوسرے مصرعہ میں (خاکستر قلب و جگر کر دے) بھی صحیح نہیں۔ محاورہ میں یوں کہیں گے کہ "قلب و جگر خاک کر دے"۔ قلب و جگر کو خاکستر کر دے" لیکن ترکیب اضافی کے ساتھ اس وقت تک مفہوم پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ "خاکستر قلب و جگر" کو کیا کر دے۔ یہ شعریوں ہونا چاہئے زمانہ ہو چکا، ہے طور کا ماحول افسردہ خدا را بھرا سے سمورہ برقی و شرر کر دے

صفحہ ۱۴۸

کلیسا میں بھی مجھ کو موقع تکمیل مستی ہے مجھے محراب کعبہ میں بھی اذن بت پرتی ہے  
(موقع) کا لفظ کتنا بے موقع استعمال کیا گیا ہے۔ بجائے اس کے (فرصت) ہونا چاہئے تھا۔ جو (اذن) کی ریت سے بھی یہاں حد درجہ موزوں ہے۔

صفحہ ۹۵ - نظم "کسی کی یاد میں"

دورِ صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو اب مسرت کبھی ہوتی ہے گر کم مجھ کو  
دوسرا مصرعہ بہ لحاظ محاورہ انداز و بیان صحیح نہیں۔ پہلے مصرعہ کی ترکیب الفاظ کا تقاضہ یہ تھا کہ مفہوم اس طرح ظاہر کیا جاتا کہ اب اگر کبھی مسرت ہوتی بھی ہے تو بہت کم یا جلد فنا ہو جانے والی لفظ (کم) تعداد و کیفیت دونوں کے لئے مستعمل ہے لیکن اس مصرعہ میں یہ لفظ (کیفیت) ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ اور تعداد کا مفہوم لفظ (کبھی) سے پورا ہوتا ہے۔ اس لئے میری رائے میں شعریوں ہونا چاہئے تھا:-

دورِ صیاد میں اس درجہ ہوا غم مجھ کو کہ مسرت کبھی ہوتی ہے تو کم کم مجھ کو  
اسی نظم کا دوسرا شعر یہ ہے:-

ہم نفس فکر خوشی کیا جو بہار آئی ہے زندگی میں ہے فقط فرصت ماتم مجھ کو  
لیکن پانچویں شعر کے پہلے مصرعہ میں آمد بہار کے خلافت یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ:-  
ابھی خالی ہیں وہ شاخیں جو کبھی تھیں گلریز

اس نظم کا دوسرا بند پورا اصلاح طلب ہے پہلا شعر ملاحظہ ہو:-

باغبان نظم غلط سے ہے پریشان ہنوز آشیانوں میں سکوں کا نہیں سامان ہنوز



معلوم نہیں (نظم غلط) کس مفہوم کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے علاوہ اس کے باغبان کی پریشانی اور آشیانوں کا سامان سکون سے خالی ہونا۔ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں۔  
دوسرا شعر ہے :-

پتہ پتہ سے ہے طاری وہی ہیبت اب تک      ذرہ ذرہ میں بپا ہے وہی طوفان ہنوز  
پہلے مصرعے میں بجائے (سے) کے (پہ) چاہئے اور دوسرے میں بجائے (میں) کے (سے)۔  
تیسرا اور چوتھا شعر ملاحظہ ہو :-

منزل اک قافلہ نو سے پریشیاں ہے ابھی      قافلہ ندرت منزل سے ہے حیران ہنوز  
عظمت رفتہ کے آثار کہاں ہیں پیدا      غلطی خیز فضا میں ہیں پشیمان ہنوز  
نہ ایک مصرعہ کا ربط دوسرے مصرعہ سے پایا جاتا ہے اور نہ ایک شعر دوسرے سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ حقیقتاً اس کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے اور جو کہہ رہا ہے اس کا تعلق نظم کے عنوان یا سیاق و سباق سے کیا ہے۔ (قافلہ نو) سے کیا مراد ہے، پھر منزل کا اس سے پریشان ہو جانا اور قافلہ کا ندرت منزل دیکھ کر حیران رہ جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں عظمت رفتہ سے کس طرف اشارہ ہے اور غلطی خیز فضاؤں کی پشیمانی سے کیا ظاہر کرنا مقصود ہے۔

پانچواں شعر یہ ہے :-

ایک بھولی ہوئی امید بر آئی ہے گھر      دل افسردہ میں باقی ہیں کچھ ارمان ہنوز  
پھر بند اس شعر پر ختم کیا گیا ہے :-

کہیں گل ہے کہیں گلچیں ہے کہیں مالی ہے      ابھی صدر چمنستاں کی جگہ خالی ہے  
اول تو (بھولی ہوئی امید) کے متعلق یہ لکھنا چاہئے تھا کہ وہ (یاد آئی ہے) نہ یہ کہ (بر آئی ہے) علی الخصوص اس وقت جبکہ اگلے شعر میں یہ کہہ کر کہ (ابھی صدر چمنستاں کی جگہ خالی ہے) تکمیل آرزو کی طرف اس کی حسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ”کہیں گلچیں ہے کہیں مالی ہے“ لکھا ہے، حالانکہ گلچیں، باغبان اور مالی سب ایک ہی چیز ہیں۔

صفحہ ۹ پر ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ”اے چراغ صبح سن“ جو شاعر کی گزشتہ حسرتناک زندگی کا مرثیہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظم کیفیات سے لبریز ہے لیکن افسوس ہے کہ غلطیوں سے یہ بھی خالی نہیں۔



ایک بند میں اور دلوں کی خوش کامی اور اپنی محرومی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

سرد ہے وہ انجمن جو تھی حق و باطل فروش  
لینگے حصہ بقدر ذوق و قسمت دل فروش  
عیش منزل ہے رہیں ظلمت و بے رونقی  
ہو گیا نظروں سے پوشیدہ مہ منزل فروش  
کون ہے اب کس سے سودائے محبت کیجئے  
آہ، باقی ہے وہ محفل اور وہ محفل فروش  
جنس من صرف حریفان شد خریداری کجا  
یوسفم ہمراہ گرگاں، گرم بازاری کجا

سیما صاحب فارسی ترکیبوں کے استعمال میں اکثر جادہ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور الفاظ و ترکیب کی ظاہری خوشنمائی سے اس درجہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ مفہوم کی طرف ان کی نگاہ جاتی ہی نہیں۔ پہلے شعر میں انجمن کی صفت (حق و باطل فروش) ظاہر کی ہے۔ فروختن یا فروشیدن کے معنی بیچنے کے ہیں اور فارسی میں ظاہر کرنے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ میرزا صاحب کا شعر ہے:-

ساکنان حرم از قبلہ نما آزادند  
رہنمائی بہ من لے خضر بیا باں فروش

ظاہر ہے کہ (حق و باطل فروش) یہاں بھی اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور مصرعہ کا مفہوم صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ”وہ انجمن جو حق و باطل کی ظاہر کر دینے والی تھی اب سرد ہے“ لیکن شاعر نے قبل و بعد دستور انجمن کی جو کیفیت ظاہر کی ہے وہ یہ ہے کہ اغیار و خریف تو کامیاب ہو گئے لیکن وہ ناکام رہا۔ اس لئے اس کا کھٹا ہوا نتیجہ یہ نکلیگا کہ شاعر کا دعوائے محبت باطل تھا اور اغیار کا حق، حالانکہ ٹیپ کے شعر میں وہ انھیں (گرگ) ظاہر کر کے ان کے باطل ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ یہ ہے وہ تضاد معنوی جو اکثر فارسی ترکیبوں کے دلدادہ شاعروں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں اپنے حریفوں کو شاعر نے ”دل فروش“ ظاہر کیا ہے جو شاید اس کے نزدیک بڑی چیز ہے، درانحالیکہ ایک عاشق کا پہلا کام یہی ہوتا ہے۔

دوسرے شعر کا معنوی نقص ملاحظہ ہو:-

پہلے مصرعہ میں تو یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ صرف عیش منزل مفقود ہے اور دوسرے مصرعہ میں ”مہ منزل فروش“ کی پوشیدگی دکھا کر، منزل ہی کو غائب کر دیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے (عیش منزل) کا رہین ظلمت و بے رونقی ہونا صحیح نہیں۔ منزل کو بے رونق کہہ سکتے ہیں نہ کہ (عیش) کو۔ ”شاعر امروز“ کے عنوان سے ایک نظم صفحہ ۱۱۰ پر نظر آتی ہے۔ اس میں سیما صاحب شعراء موجودہ کو مخاطب کر کے دریافت فرماتے ہیں۔

حشر اٹھایا ہے کبھی اک نغمہ بیتیاب سے  
کیا رہا باہر دل کو چھڑا ہے کبھی مضراب سے



کیا کسی کا دل پیجا ہے ترے افکار سے کیا کبھی شعلے تراشے ہیں لبِ گفتار سے پہلے شعر میں لفظ (اک) زاید ہے اور (رباب دل) کے چھڑنے کے لئے مضرب بھی کوئی خاص ہونا چاہئے مثلاً مضرب احساس، مضرب تاثر محض مضرب بالکل غلط ہے۔

دوسرے شعر میں لبِ گفتار سے شعلہ تراشنے کی بدعت بھی پسندیدہ نہیں۔ لب سے شعلوں کی تراوش ہو سکتی ہے لیکن تراشنا لبوں کا کام نہیں۔ آگے چل کر چند سوال اور کرتے ہیں:

کیا میسر ہیں تجھے انگڑائیاں تخیل کی کیا صدا تو نے سنی ہے شہرِ جبریل کی شام کی تصویر کھینچی ہے سحر کے نور سے تجھ کو آئی ہے کبھی بوئے کفن کا نور سے لرزشِ شبِ نیم سے پھولوں کے ورق پر تو نے کیا پردہ اسرار کی محرم ہے کیا تیری نگاہ پہلے شعر میں "تخیل کی انگڑائیاں" بالکل بے معنی بات ہے اور دوسرے مصرعہ سے پہلے مصرعہ کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اگر دونوں کے باہم مربوط ہونے پر اصرار کیا جائے تو پھر معنی یہ ہوں گے کہ تخیل کی انگڑائیوں کو شاعر نے شہرِ جبریل کی صدا سے تعبیر کیا ہے، درانحالیکہ بالِ جبریل سے پیدا ہونے والی آواز کو تخیل کی انگڑائی کہنا حقیقتاً اس کی توہین ہے

دوسرے شعر کے بھی دونوں مصرعے دو تخت ہیں علاوہ اس کے شاعر کے اصل مدعا سے بھی یہ شعر بالکل الگ ہے۔ سحر کے نور سے شام کی تصویر کھینچنا تو کوئی قابلِ فخر بات نہیں، البتہ اگر سوادِ شام سے سحر کا نور پیدا کیا جائے تو بیشک یہ ایک کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کا نور سے بوئے کفن کا احساس بھی کسی ذہنی علویا جذباتی ارتقا کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ ایک متشاکم کیفیت کا اظہار ہے جس کو سیلاب صاحب پسند نہیں کرتے۔ تیسرے شعر میں لفظ (طرح) بالکل بیکار ہے اور اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ مصرعے یوں ہوتا تو بہتر تھا:

مصرع تر بھی کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا یا مصرع تازہ کوئی دیکھا کبھی لکھا ہوا  
شبِ نیم اور پھول کی رعایت سے مصرع تر یا مصرعہ تازہ زیادہ موزوں ہے۔

چوتھے شعر میں دریافت فرماتے ہیں کہ "کیا ہر ذرہ میں تجھ کو ایک راہ نظر آتی ہے" حالانکہ (ذرہ میں) کوئی راہ نظر نہیں آ سکتی البتہ وہ کسی راہ کی طرف رہنمائی ضرور کر سکتا ہے۔ یہ مصرعے یوں ہونا



چاہئے :- کیا نظر آئے ہیں ذروں میں کبھی خورشید راہ  
اسی نظم میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :-

میں ترسے پھپکے ہوئے جذبات کا قایل نہیں

(پھپکنا) درختوں کے نشوونما کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جسم پر آبلے وغیرہ پڑ جاتے ہیں تو اس وقت بھی  
(پھپکنا) بولتے ہیں، لیکن جذبات کے ساتھ اس کا استعمال اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ علاوہ اس کے معنی نقص  
ہے کہ اگر شاعر امر وز کے جذبات واقعی اتنے گرم ہیں کہ وہ پھپک اٹھے ہیں تو یہ دلیل گرمی جذبات کی ہے نہ کہ  
ان کی افسردگی کی، اور اس صورت میں ”شاعر امر وز“ پر الزام کیا عاید ہو سکتا ہے۔

صفحہ ۱۲۲ - نظم ”آئینہ افق“

کیا خبر سینے میں پیوست ہیں کتنے نشتر خون رستا نظر آتا ہے رگ جاں سے مجھے  
پہلے مصرعہ کا انداز بیان ظاہر کرتا ہے کہ بہت سے نشتر سینے میں پیوست ہیں، لیکن دوسرے مصرعہ میں اسکا  
نتیجہ صرف خون کا رستا ظاہر کیا ہے۔ اس صورت میں خون رستا چاہئے یا اس کو بہ نکلنا چاہئے۔  
پھول سے ملتی ہے اک تلخ شراب انجام پھانس ہوتی ہے عطا خار بیاباں سے مجھے  
پہلا مصرعہ بالکل بے معنی ہے اور پھول سے انجام کی تلخ شراب کا ملنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ دوسرے مصرعہ سے  
بھی کوئی خاص معنی پیدا نہیں کئے گئے، خار بیاباں سے پھانس عطا نہ ہوگی تو کیا پھولوں کی سیج ملے گی۔  
اسی نظم کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں :-

بنجودی میں جو کبھی میں نے جھکالیں نظریں موت نے چھڑ دیا گورِ غریباں سے مجھے  
رات کا ایک وہ حصہ جو سحر تک ہو سیاہ ایک انبار اندھیرے کا ہیب و دیراں  
زندگی کی نہیں ضروریز کہیں چنگاری صرف ہے راکھ کا اک ڈھیر فضا میں لرزاں

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے۔ معلوم نہیں سیاب صاحب نے کیا مفہوم ظاہر کرنا چاہا ہے۔  
ہر لفظ دوسرے سے علیحدہ ہے اور (چھڑ دینے) کا محاورہ یہاں بالکل غلط استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ مہمل ہے اور ”اندھیرے کا انبار“ بھی نہایت ناگوار بدعت ہے۔ تیسرے  
شعر میں راکھ کے ڈھیر کو فضا میں لرزاں دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ خود لفظ (ڈھیر) اس کا مقتضی ہے کہ اس کو ایک جگہ  
قائم وغیرہ لرزاں دکھایا جائے۔



اس کے بعد ایک نظم ”نقص ہستی“ کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ اس کے نقایص بھی دیکھ لیجئے :-  
 اس نظم میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ قدرت نے انسان کو فانی بنایا، دراصل ایک انسان کی خواہش یہ ہے کہ وہ  
 فنا نہ ہو اور اسی کے ساتھ خدا یا فطرت کو مخاطب کر کے یہ شکایت بھی کی گئی ہے کہ اگر انسان کی اس خواہش کو پورا کر دیا  
 جاتا تو کیا حرج تھا۔ ”خالق ہستی“ کو مخاطب کر کے شاعر دریافت کرتا ہے کہ :-

حرصیں اس درجہ فطرت کیوں ہوئی تخلیق انساں پر نہ تھی جب خود ہوس اس کو نشاطِ زندگانی کی  
 پہلے مصرعہ میں لفظ (حرصیں) اور (اس درجہ) دونوں بے محل استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ اس شعر سے پہلے فطرت کی شدت  
 حرص تخلیق ظاہر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں (ہوس اسکو) کا استعمال صحیح نہیں  
 کیونکہ نشاطِ زندگانی کی ہوس انسان کو ہے نہ کہ فطرت کو اس لئے میری رائے میں یہ شعریوں ہونا چاہئے :-  
 ضرورت کیا تھی فطرت کو کہ وہ پیدا کرے انساں نہ تھی جب قدر خود اسکو نشاطِ زندگانی کی  
 اس بند میں ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو :-

چولنت آشنائے جرئہ آب بقا کردی      زیک جام بقالب تشنہ صد سیکدہ کردی  
 پہلے مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جرئہ آب بقا مل گیا، دراصل ایک اس سے قبل اس کے فانی ہونے پر سردھنا جا رہا تھا  
 دوسرے مصرعہ سے کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا اور بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ جام بقا پانے کے بعد انسان (لب تشنہ صد سیکدہ)  
 کیونکہ ہو سکتا ہے۔ اگر بے نیاز سیکدہ کہا جاتا تو خیر ایک بات تھی۔ یہ شعریوں ہونا چاہئے :-

مرانا آشنائے جرئہ آب بقا کردی      چہا کردی کہ زیں سو تشنہ صد سیکدہ کردی  
 دوسرے بند کے دوسرے شعر میں یہ خواہش ظاہر کی جاتی ہے کہ :-

مجسم ہو کے لمتی باریابی تیری محفل میں  
 لیکن چوتھے شعر میں جسمانیّت کو غائب کر کے اظہار خیال یوں کیا جاتا ہے کہ :-  
 ہم اک لمحہ میں مثل روح تیرے پاس آجاتے

تیرے ہند کا ایک شعر ہے :- زمین پر عرش سے آنا زمین سے قبر تک جانا      یقیناً موت بعد موت، پستی بعد پستی ہے  
 زمین پر عرش سے آنا موت نہیں ہے کہ زمین سے قبر تک جانا موت بعد موت (کہا جائے)۔ ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو :-

شکایت نقص ہستی می کند عزم تلافی کن      تو انین قنار جذب الطاف اضافی کن  
 فارسیّت کے لحاظ سے تو خیر یہ شعر جتنا گرا ہوا ہو محتاج بیان نہیں، لیکن معنوی حیثیت سے بھی اس کا دوسرا مصرعہ مہمل ہو اور (الطاف اضافی)  
 (ماقیہ)



# مکتوبات نیاز

شفیق محترم - پرسوں گرامی نامہ ملا۔ اور ہر چند آپ نے اس کا جواب بہ واپسی ڈاک طلب فرمایا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت سے پہلے مجھے جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی۔ معذرت خواہ ہوں۔ غالباً اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ جس حد تک سوال صرف تعمیل ارشاد کا ہے، مجھے کیا غدر ہو سکتا ہے، لیکن اگر بحث مصلحت اور طلب رائے کی آپٹری تو یقیناً اس باب میں آپ مجھے اپنا ہمنوا نہ پائیں گے۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ دنیا میں آہن کا جواب آہن ہی سے دیا جاسکتا ہے میں خود علاج ہٹل کا بڑا حامی ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ فطرت خود کسی خاص اصول کی پابند نہیں ہے اور اس لئے انہاء فطرت کے سامنے کبھی کبھی ایسی صورتیں آجاتی ہیں کہ جی تو چاہتا ہے تلوار کھینچ کر سامنے آجانے کو لیکن کار بر آری ہوتی ہے سپرد الدینے سے۔

اس میں شک نہیں کہ آپ کو جو تکلیف پہونچائی گئی ہے اس کا اقتضا یہی ہے کہ انتقام لیا جائے، اور میں بھی یہی چاہتا ہوں، فرق یہ ہے کہ آپ انتقام لینا چاہتے ہیں اُسی ادنیٰ سطح پر آکر جو حریف نے اختیار کی تھی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی بلندی فطرت سے ایک اونچ نیچے نہ اتریں۔ آپ کے احساس خود داری کو جو صدمہ پہونچایا گیا ہے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ دوسرے کے وقار نفس کا خون کر دیا جائے، لیکن جب اس کا خمیر ہی مڑوہ ہو تو کیا صرف جسمانی آزار یا صعوبت قید و بند سے تلافی ممکن ہے۔

لیکن اگر اس کے بعد بھی آپ کو اصرار ہو تو میں تعمیل فرمان کے لئے طیار ہوں۔ مسودہ بھیجا دیجئے ہیں کسی ہوشیار وکیل سے مشورہ کر کے استغاثہ دائر کرادوں گا۔

اللہ، اللہ، آپ اپنا شمار بھی ان لوگوں میں کرتے ہیں کہ ”نہ آئیں تو بلائے نہ بنے“ کیوں پاگل ہوئے ہو۔ کیوں تماشہ بنا چاہتے ہو۔ وہ منظر کبھی دیکھا ہے جب کشتاں کشتاں جانور کو نہریں



کی طرف لیجاتے ہیں — بس سمجھ لو کہ یہی حشر تمہارا ہونا ہے۔  
اس لئے اگر خیریت چاہتے ہو، تو بے چون و چرا، چپکے کان دبائے ہوئے کل ٹھیک، بے سبب شام کو  
یہاں پہنچ جاؤ ورنہ

### تو دانی خرقہ پشمینہ داری

خط کیا، "داسوخت" ملی۔ تم پر رحم بھی آیا اور غصہ بھی۔ غصہ اس لئے کہ میرا کہنا تم نے نہ سنا، اور  
وہاں کی آمد و رفت ترک نہ کی۔ رحم اس لئے کہ جن نگاہوں کا یہ عالم ہو  
کہ اندر دل حرم می زند قافلہ را  
ان کے نزدیک تمہاری حقیقت ہی کیا ہے اور جو تباہیاں بھی تم پر نازل کریں کم ہیں۔ میں نے پہلے ہی  
تم کو سمجھا دیا تھا کہ انسان بعض اوقات خود اپنی صداقت سے بھی دھوکا کھا جاتا ہے اور آخر کار وہی ہوا۔  
تم کو اپنے خلوص پر اعتماد، ادھر نمائش بے تعلقی میں محبت کا رنگ۔ تم کیا کوئی فرشتہ ہوتا تو وہ بھی اپنی جان  
سلامت نہ لے آتا۔ ہاروت و ماروت کی مثال سامنے موجود ہی ہے، اس لئے اب یہ شور و ادب کیسا؟  
محبت میں دل کی سب سے بڑی قربانی یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے بلکہ یہ کہ وہ اندام  
جراحت بھی نہیں چاہتا۔

### نخورد زخم دریاں کوچہ کہ مرہم باشد

ہوش میں آؤ، اب بچے نہیں ہونا م خدا جوانی آئی ہے اور دیوانہ وار آئی ہے، تمہارا دل خون نہ ہو گا تو  
کیا تمہارے دشمنوں کا ہو گا۔  
اب کہ ہاتھ پاؤں کانٹوں سے مجروح ہیں میں بھی یاد آ رہا ہوں، وطن کی یاد بھی ستا رہی ہے۔ لیکن  
جب پھولوں کی سیج پر ہو گے تو میں کیا خدا بھی یاد نہ آئے گا۔  
کیوں گھبراتے ہو، بادل آئے ہیں تو نکل بھی جائیں گے، آج زیادہ نہ رو گے تو کل زیادہ ہنسو گے کیونکر

استغفر اللہ، تم نے بھی عجیب مذاق کیا۔ کل آپ کا خط لیکر وہ تشریف لائے اور اس تکلف و تضرع  
کے ساتھ کہ اب کیا کہوں۔



آنکھوں میں سرمہ دنبالہ دار، ہونٹوں پر لکھے کی بہار، گالوں پر غازہ، ابرؤں پر سرمہ، پنڈلیوں میں چھپا ہوا تنگ پاجامہ، پاؤں میں وصلی کا زر کار جوہر، تنزیب کی تنگ اچکن، نیچے جامدانی کے کرتہ کی پھین بس یوں سمجھ لو

### ہنیش پیرا ہن گل تنگ بود

بیٹھتے ہی کلام کی فرمائش کی، مدعا یہ تھا کہ میں فرمائش کر دوں۔ بس پھر کیا تھا، یوں سمجھ لو کہ، بجے شام سے آدھی رات تک جسمانی و روحانی کوئی اذیت ایسی نہ تھی جو اٹھارکھی گئی ہو۔ اخلاقاً پہلے تو دو چار غزلوں کی داد میں نے دی، لیکن اس کے بعد حب زبان نے یار نہ دیا تو خاموش ہو گیا، لیکن وہاں تو یہ عالم تھا گویا سیلاب سے بند ٹوٹ گیا ہے اور دنیا کی کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی۔

خدا خدا کر کے جب بارہ بجے یہ دورہ ختم ہوا تو فرماتے کیا ہیں اجازت ہو تو صبح پھر حاضر ہوں۔ میں نے کہا کہ یوں آپ کا گھر ہے جب مزاج میں آئے تشریف لائے، لیکن کل صبح میں ایک نہایت ضروری کام سے آگرہ جا رہا ہوں۔ فرمانے لگے، خیر کوئی حرج نہیں میں صبح حاضری ضرور دوں گا کیونکہ ممکن ہے کسی وجہ سے یہ مفروضہ ہو جائے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں اُن کے جانے کے بعد ہی فوراً اسٹیشن چلا آیا اور یہیں سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دیکھوں کب تک خارج البلد رہنا پڑتا ہے۔ خدا کے لئے کچھ بتاؤ کہ یہ کون ہیں، کیا ہیں اور تمہارے پاس کیونکر پہنچ گئے کہ یہ بلا تم نے میرے سر پر مسلط کر دی۔

### مطاعی الاعز،

اس میں شک نہیں کہ آپ سے زیادہ محبت کرنے والا مجھے اور کوئی نہیں مل سکتا، یہ بھی درست ہے کہ دنیا کی ہر آسائش میرے لئے آپ کے یہاں مہیا تھی اور قولاً و فعلاً ہر قسم کی آزادی مجھے میرے۔ لیکن اب کیا کہوں کہ مجھے وہاں کیا وحشت تھی اور میرے لئے وہاں ٹھہرنا کیوں دشوار ہو گیا۔ آہ، کس چرمی داند کہ در بزم تو غمنا کم چیرا

### آقائے محترم،

دنیا میں ظلم و ستم کی تباہ کاریاں اتنی شدید نہیں ہیں، جتنی لطف و کرم کی ہیں۔ اس کے انتقام کے لئے تو آستینیں چڑھائی جاسکتی ہیں، لیکن اس کا علاج سوائے سر جھکا کر خاموش رہ جانے کے اور کچھ نہیں۔ پھر



غور فرمائیے کہ میں کب تک اپنے دل کا خون کرتا رہتا اور آپ کو کیونکر سمجھا سکتا کہ مجھ میں اب تاب تحمل باقی نہیں۔  
علاوہ اس کے ایک بات اور بھی تھی جو بالکل میرے ضمیر کے خلاف آپ کا دل دکھانے پر مجبور کر رہی تھی اور اگر شاید  
دو دن اور میں وہاں رہتا، تو آج آپ کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتا۔

بہر حال آپ کا ممنون احسان ہوں اور جب تک زندہ ہوں اس کا اعتراف کرتا رہوں گا۔ لیکن اب آپ کے  
پاس آکر قیام کرنا بالکل ناممکن ہے۔ امید ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل پر آپ مجھے مجبور نہ کریں گے، کیونکہ  
اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ میں بالکل خاموش ہو جاؤں گا اور پھر آپ کو اور زیادہ شکایت پیدا ہو جائے گی۔ خدا حافظ

## بعض کتابوں کی رعایتی قیمت صرف خریداران نگار کے لئے

| نام کتاب                                   | اصلی قیمت | رعایتی قیمت | نام کتاب                        | اصلی قیمت | رعایتی قیمت |
|--------------------------------------------|-----------|-------------|---------------------------------|-----------|-------------|
| نگارستان (نیاز فچپوری)                     | ۷۰        | ۴۰          | فراست التحریر                   | ۸۰        | ۴۰          |
| جمالستان (نیاز فچپوری)                     | ۷۰        | ۴۰          | شاعر کا انجام (نیاز فچپوری)     | ۱۰۰       | ۴۰          |
| ترغیبات جنسی (نیاز فچپوری)                 | ۷۰        | ۴۰          | فلسفہ مذہب                      | ۷۰        | ۴۰          |
| مجموعہ استفسار و جواب (نیاز فچپوری)        | ۷۰        | ۴۰          | لالہ رخ                         | ۷۰        | ۴۰          |
| حکایت قدیم کے ساتھ چند گھنٹے (نیاز فچپوری) | ۷۰        | ۴۰          | مثنوی زیر عشق مع تصاویر و مقدمہ | ۸۰        | ۴۰          |
| نذرات نیاز (نیاز فچپوری)                   | ۱۲۰       | ۶۰          | فلسفہ شوہنہار                   | ۶۰        | ۴۰          |
| جذبات بھاشا (نیاز فچپوری)                  | ۱۲۰       | ۶۰          | منجیلے                          | ۶۰        | ۴۰          |
| فراست الید (نیاز فچپوری)                   | ۷۰        | ۴۰          | گلابی اردو                      | ۸۰        | ۴۰          |
|                                            |           |             |                                 |           |             |

- (۱) محصول ڈاک: مہ خریدار ہوگا لیکن تمام کتابیں ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک بھی نہیں لیا جائے گا
- (۲) یہ رعایت صرف خریداران نگار کے لئے ہے اس لئے ان کو اپنا نمبر خریداری بھی درج کرنا چاہیے۔
- (۳) یہ رعایتی قیمت صرف اخیر جون ۱۹۳۵ء تک ہے، اسکے بعد شاید اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ رہے۔ نیچر نگار لکھنؤ



# لکھنؤ کی داستان گوئی

دنیا میں کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جہاں علم و ادب اور تہذیب زبان کی ترقی محاکات اور قصص سے نہ ہوئی ہو اسی لئے مہذب ملک میں آپ کو محاکات کے پرستار ملیں گے اور جس ملک کے جس قدر اقتدار وسیع ہونگے اس قدر ان کے قصص و حکایات میں ترقی نظر آئے گی۔ بات یہ ہے کہ علم ادب قصص اور محاکات ہی سے ترقی پاتا ہے اور جب کسی ملک میں تمدن پیدا کرنا ہوتا ہے تو ملک کے نامور لوگ دوسری زبان اور دوسرے ملک کے قصے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے ملک کو تمدن بناتے ہیں۔

ہندوستان میں داستان گوئی کا رواج کب سے ہوا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ناچ گانے، ستار اور مردنگ کا رواج کتھا میں بھی بہت ہو گیا تھا اور ہندوؤں کی عورتیں بھی کتھا میں شامل ہوتی تھیں لیکن اہل اسلام کی کوئی سوسائٹی کوئی تماشہ گاہ شہر میں ایسا نہ تھا جہاں وہ بیٹھ کر دل بہلائیں علاوہ اس کے بھاکا زبان سے ان کو دلچسپی بھی نہ تھی اس لئے صرف عورتوں کا مجمع دیکھ کر وہ بھی چلے جاتے تھے، اس بات کو فیضی نے محسوس کیا اور ایک طویل داستان اہل اسلام کی فارسی میں لکھی جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی، اسی سلسلہ میں فیضی نے بھی داستانیں لکھنا شروع کیں اور سب سے اخیر میں میر محمد تقی خیال نے کتاب بوتان خیال سات جلدوں میں تصنیف کی جس کی قبولیت کا حال سب کو معلوم ہے۔ جب اردو زیادہ رائج ہوئی تو سب سے پہلے فیضی کی تصنیف داستان امیر حمزہ اردو میں ترجمہ ہوئی اس کے بعد بوستان خیال کا ترجمہ خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان دہلوی نے کیا۔

سب سے پہلے مرزا طور نے داستان گوئی کے فن میں اصلاح کی اور جو غیر فصیح الفاظ داستان گوؤں کی زبان پر جاری تھے ان کو نکالا، لکھنؤ میں سب سے زیادہ مشہور داستان گو بڑے منشی (میر فدا علی) تھے جو اشعار کا استعمال کثرت سے کرتے تھے اس کے بعد چھوٹے منشی نے خوب نام پیدا کیا۔

نواب ہادی علی خاں شہزادہ نیشاپوری بھی نہایت اچھے داستان گو تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ فصیح و بلیغ داستان کہنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔



امیر خاں وزیر باغ کی کوٹھی میں باروں مہینے شہزادہ ایرج کا حال سنایا کرتے تھے ہر بُدھ کو ان کی داستان ہوا کرتی تھی۔ حیدری کے اما مباڑہ میں بھی ہمیشہ داستان سنائی جاتی تھی۔ ایک نواب صاحب تھے چمڑے کا بٹوالے ہوئے آتے تھے اور نواب آغا حیدر افسوں آغا میر کی ڈیوڑھی پہر داستان سنایا کرتے تھے۔ سنایا کہ لکھنؤ میں کوئی شخص امبکا پرشاد کا لیٹہ تھے، ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کے داستان گوئوں میں ملازم تھے اور نواب کلب علی خاں عرش آشاں کے عہد تک ملازم رہے، ایک مرتبہ کسی طلسم کا بیان ختم کئے بغیر نواب صاحب سے چھ مہینے کی رخصت لیکر لکھنؤ چلے آئے بعد ختم رخصت جب حاضر بارگاہ ہوئے تو اسی جگہ سے بیان کرنا شروع کیا جہاں سے چھوڑ گئے تھے اس پر نواب صاحب نے بہت تعجب فرمایا اور ان کی یادداشت کی بہت تعریف کی۔ ان سب داستان گوئوں میں رسالدار نواب محمد حسین خاں وثیقہ دار فاضل مرتبہ کے تھے یہ نیشاپوری خاندان سے تھے اور پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار وثیقہ پاتے تھے، نواب شیش محل کے دربار میں ہمیشہ داستان کہا کرتے تھے ان کی شہرت سنکر نواب بہرام الدولہ نے ایک مرتبہ حیدر آباد میں طلب فرمایا تھا۔ صرف پندرہ روز وہاں قیام کیا اور ایک طلسم سنا کر چلے آئے وہاں ان کا دل نہ لگا کہتے تھے کہ داستان کی تعریف کرنے والے ایسے کہیں نہیں ہیں جیسے لکھنؤ میں۔ پھر رام پور طلب کئے گئے اور وہاں بھی کچھ دنوں قیام کر کے چلے آئے۔ ان کے بعد ان کے ایک شاگرد تھے مولوی احمد حسن ساکن وزیر گنج یہ بھی اچھی داستان سناتے خصوصاً مختار نامہ بہت اچھا بیان کرتے تھے۔ عہد شاہی کے بعد جب داستان گو کم ہو گئے تو منشی نو لکشور نے ان داستانوں کو چھپوانے کی کوشش فرمائی اور اسی کام کے لئے منشی محمد حسین جاہ کو تجویز کیا یہ بڑے منشی میر فدا علی کے شاگرد تھے، ان کے پاس داستانوں کی بہت سی جلدیں قلمی محفوظ تھیں۔

ہوش ربا کی پہلی دوسری تیسری چوتھی اور پانچویں جلد کا پہلا حصہ لکھا تھا کہ منشی صاحب سے معاوضہ کے متعلق کچھ جھگڑا پیدا ہوا، آخر ملازمت ترک کر کے منشی گلاب سنگھ لاہوری کے کارخانہ میں چلے آئے۔ منشی گلاب سنگھ کا مطبع اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھا مگر وہ اتنی بڑی کتاب فوراً نہیں چھپوا سکتے تھے اسلئے منشی گلاب سنگھ نے پہلے ایک مختصر ٹکڑا ہوش ربا کا چھاپا اور پھر منشی احمد حسین قمر لکھنوی نے دوسری جلد حصہ پنجم لکھی، جسے منشی صاحب نے فوراً شائع کر دیا ملک تو اس کا منظر تھا ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور پھر ہوش ربا کی باقی جلدیں جلد چھپنے لگیں، لوگ کہتے ہیں کہ منشی قمر سے زیادہ کوئی زود نویس داستان گو نہ تھا۔



اب یہ بحث آپری کہ منشی محمد حسین جاہ اچھی داستان لکھتے ہیں یا منشی احمد حسین قمر اس کا فیصلہ ملکتے اس طرح کیا کہ منشی محمد حسین جاہ بزم اچھی لکھتے ہیں اور منشی احمد حسین قمر رزم بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک اور بھی داستان گو تھے ان کا نام تھا امیر خاں ان سے بڑھ کے عیاری کوئی نہ بیان کرتا تھا، لیکن وہ منشی صاحب کے یہاں نہیں گئے اور ان کو ناز تھا کہ ہماری عیاریاں اس حسن و خوبی سے کوئی نہیں لکھ سکتا داستانوں میں عمر عیاری کی جتنی عیاریاں ہیں سب امیر خاں کے بیان کا چربہ ہیں لوگ کہتے ہیں کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے نواب صاحب رام پور کے ارشاد سے ایک داستان کہی تھی جس کا نام شگوفہ اُلفت تھا یہ کتاب مطبع نامی لکھنؤ میں چھپی تھی اس میں طلسم اچھا باندھا تھا منشی اسماعیل منیر نے بھی ایک داستان نواب صاحب رام پور کے حکم سے لکھی تھی جس میں رزم بزم دونوں خوب تھیں مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے دربار میں حکیم میرضامن علی جلال کے دال حکیم سید اصغر علی داستان گوئی کے عہدے پر ملازم تھے اور بعد ان کے نواب کلب علی خاں کی سرکاری اس عہدہ پر ملازم رہے۔

منشی احمد حسین قمر نے ہوش ربا کی جلدیں ختم کر کے صندلی نامہ شروع کیا یہ ہوش ربا کے بعد کا طلسم ہوا میں شہر فرعونہ کی تباہی، لقا کی گرفتاری اور باغ ارم کی سیر خوب لکھی ہے اس کے بعد تورج نامہ کا سلسلہ قائم کیا جس میں امیر کی نقاب دار سے کشتی اور اسی حالت میں دونوں کی بیہوشی طلسموں کی لڑائیاں دیو اور جادو گروں کی چوٹیں درج ہیں۔ پھر دوسری جلد تورج نامہ کی لکھی ہے اس میں رستم ثانی فرزند ایرج کی داستان ہے۔ آٹھواں دفتر لعل نامہ ہے یہ دو جلدوں میں ہے جلد اول میں عشقیہ داستان ہے جلد دوم میں صاحب قرآن کی روایتی طلسم خونخوار کی طرف بیان کی ہے، اس کے بعد منشی احمد حسین قمر نے طلسم خیال سکندری اور ہفت پیکر فتنہ نور افشاں کی جلدیں ختم کر کے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد شیخ تصدق حسین داستان گو نے جو ایک جاہل آدمی تھے داستان میں ایک نئی روش نکالی ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ یہ کاتبوں سے داستان لکھواتے تھے اور مطبع منشی نوکشور کو دیتے تھے ان کے یہاں عبارت آرائی اور چہرہ پردازی کم تھی اور جا بجا جو داستان گو اشعار برجستہ ملا تے ہیں انکا لطف بھی کم تھا مگر کاتب اپنے استاد کی غزلیں شامل کر کے کچھ لطف پیدا کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب بھاو لپور نے ان کو بلوایا تھا اور داستان شکر بہت محظوظ ہوئے لیکن زاید قیام ہوا انعام اکرام لیکر چلے آئے تھے منشی قمر کے بعد انھوں نے داستان لکھنے کا سلسلہ قائم کیا اور طلسم آفتاب شجاعت لکھا۔ آفتاب شجاعت ختم کر کے شیخ تصدق حسین گلستان باختر کی داستان لکھی اور طلسم



پورا کیا اس کے بعد طلسم خیال سکندری کی تین جلدیں لکھیں۔ اس کے بعد طلسم زعفران زار سلیمانی لکھا۔ اتنی کتابیں لکھنے کے بعد شیخ تصدق حسین کا بھی انتقال ہو گیا۔ منشی قمر اور شیخ تصدق حسین نے اس قدر داستانیں لکھی ہیں کہ ہندوستان میں کسی داستان گو نے نہیں لکھیں۔

لکھنؤ کے تمام داستان کہنے والے افیون کا استعمال بہت کرتے تھے اور اسی کے سرور میں داستانیں کہا کرتے تھے۔ اب لکھنؤ میں ایک شخص ٹوٹے مارے، افیونیوں کا نام زندہ رکھنے والے عید کی ٹرکی رونق مرزا ٹلن باقی رہ گئے ہیں، دن بھر کا مدانی بناتے ہیں اس میں جو پیسے ملتے ہیں افیون کی نذر ہو جاتے ہیں، بیڑ تیار کر کے بیچ لیتے ہیں، مگر ابھی سال اس پر بھی اورس پڑ گئی دو تین بیڑ بھاگ گئے ایک کی ٹانگ چوہے نے کاٹ لی وہ مر گیا، پارچہ والی گلی سے دوپٹی ٹوپی چکن کی چار آنے کو مول لیکر اسے کفن دیا کمپنی باغ میں دفن کر رہے تھے کہ پولیس نے گرفتار کر کے دفعہ ۴۴۴ قائم کی بیچارے نے بہت منت کی سماعت نہ ہوئی اس نے کہا تھنے کمپنی باغ کو قبرستان بنا دیا آج تک تو اس میں کوئی قبر نہ تھی۔ یار دوستوں کی کوشش سے رہائی نصیب ہوئی بیڑ کا تیج کیا چالیسواں کیا سال بھر سو گوار رہے، مگر زندہ دل ہیں، عید کی ٹر میں جاتے ہیں افیون کی ڈبیا اور بیالی گلی سے لگائے رکھتے ہیں، ٹر میں بھی دو بجے دن سے حقہ کو نیلے تمباکو چلم اور افیون لیکر موتی جھیل سے کچھ فاصلہ پر ڈیرہ خیمہ ڈال دیتے ہیں اور بڑے زنانے سے داستان شروع کرتے ہیں، کچھ گئے آتے ہیں کچھ میٹھے چاول اسی سے سب افیونیوں کی روزہ کشائی ہوتی ہے، میٹھے لڑتے ہیں ایک چھوٹا سا میلہ ہوتا ہے مگر بیچارے مرزا ٹلن اپنی بساط کے موافق سب کی مدارات گنڈیریوں سے کرتے ہیں کبھی دو چار پیوندی بیڑ بھی میسر آ گئے تو یہ اور بات ہے داستان شروع ہوتی ہے چہرہ زبردست بیان کرتے ہیں انکسار مزاج میں ایسا ہے کہ جہاں کسی اچھے داستان گو کا نام آتا ہے زور سے اپنے کان اٹھ کر کہتے ہیں واللہ وہ استاد تھے میں ایک ناچیز ہوں انھیں کا نام لیکر کچھ داستان کہہ لیتا ہوں جاہل ہوں میرا ان کا کیا مقابلہ اگر داستان کہنے میں کسی نے جاہلی لے لی تو غضب ہو گیا اب ان سے داستان نہیں کہی جاتی اور جب تک چھ پیسے کی افیون کھول کر نہ لی لیں جو اس قاب میں نہیں آتے نواب محمد یوسف خاں خلیفہ نواب مرزا ہادی بن نواب رفعت الدولہ بیان کرتے ہیں اب عید کی ٹر کیا ہوتی ہے اور مرزا ٹلن کیا چیز ہیں جو داستان کہیں گے بھیا رنگر کے وقت تک کچھ داستان گوئی کا چرچا تھا اور عید کی ٹر بھی کچھ ہوتی تھی جتنے ایک زمانہ میں عیش باغ کے میلہ کی رونق دکھی تھی اور داستان بھی سنی تھی آخری میلہ میں بیس بیس کوس کے داستان گو آتے تھے اور مسجد کے قریب خیمہ میں ٹھہرتے تھے ان کی خاطر مدارات یہاں کے روسا کی طرف سے ہوتی تھی چار بجے سب داستان گو اپنی اپنی داستان سنانے تھے اور لوگوں سے داد لیتے تھے۔ حقہ ہر دم بھرا رہتا تھا اور لوگ جمع رہتے تھے دس بجے رات تک اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے ایک مرتبہ نواب جلالیت علی خاں نے اپنے ملازم حسین علی داستان گو کو اس میلہ میں بھیجا جب سب داستان گو بیان کر چکے تو حسین علی خاں نے اپنی داستان شروع کر دی بس۔ جی چاہتا تھا کہ بیٹھے سا کرے، بیٹھے بیٹھے سب لوٹ گئے۔ اب تو ایک داستان گو بھی ایسا نظر نہیں آتا۔۔۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی



# آخری فیصلہ۔ مگر۔!

ہاں، سچ ہے! میں تمہیں دنیا کے ہر گوشہ میں بدنام کیا کرتا ہوں اور تم بیچاری، بے قصور، منہ بند، انا کی کلی، مردم آزاری سے بے نیاز، ستم ظریفی، وفا کشی اور صمدانہ مال پر دانی سے بے بہرہ، ”کوہسار“ کی حسین وادیوں میں بیٹھی ہوئی ایشور کی مالا جینے میں ہمہ تن مصروف اور سراپا عبادت بنی رہتی ہو۔

کیوں نہ ہو، اچھتوں کے گن، اچھے ہی ہوتے ہیں اور مجھ جیسے پاپیوں کے تاریکین اور ان سے تاریک تر راتیں انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھالنے تک چین نہیں پاسکتیں۔ سنو، یہ ایک سردرات تھی۔ اس قدر سرد کہ تم اور میں اپنے دبیز لبادوں میں بید کی مانند کانپ رہے تھے۔ ہر شجیرہ کے کھیت سے متصل، بیری کے ٹھنڈے ٹھنڈے سایہ میں خاموش ہو جانے والی آگ کی دو ایک چنگاریاں آٹھ آٹھ دس دس لمحوں کے وقفے سے فضا میں رقص کرتی نظر آتی تھیں، پنڈت اپنی کتھا ختم کر کے ہیبت ناک ستار کندھے پر رکھے ہوئے پاس کی جھونپڑیوں کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ کسان اور اس کے ساتھی، رام اور سیتا کی داستان اپنے وفا شعار سینوں میں محفوظ کر کے سیاہ کبیل کو اپنے نیم غریاں جسم پر سمیٹے ہوئے نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ اور میں اور تم، فلسفیانہ انداز میں اپنی اپنی خواب گاہ کو واپس ہو گئے۔

دوسری صبح میں بہت سویرے ہی جاگ اٹھا تھا اور تھوڑی سی جہل قدمی کے بعد نیم کے خوبصورت جھولے پر بیٹھا ہوا ”جماستان“ کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ دفعۃً تم، خلافتِ عادت وہاں نمودار ہوئیں، اور آنکھیں مل مل کر اور بکھرے ہوئے کیسوؤں کو چہرے سے ہٹا ہٹا کر تبسم کا ایک نوشگفتہ پھول میری گود میں گراتی ہوئی وہاں سے جھیلی کے جھنڈ کی طرف چل دیں، ”جماستان“ میرے پاؤں کی لغزش کے بوسے لے رہی تھی اور میں کسی قدر بلند آواز کے ساتھ

بروایں دام بر مرغِ دگر نہ

کہ عنقار بلند ست آشیانہ

دہراستے ہوئے تمہیں تمہارا یہ حسین نحف واپس کر دینے کی فکر میں موجودات کے ہر ذرہ پر مستفسرانہ نگاہیں



ڈال رہا تھا۔ پھر ایک سہانی شام، جب کہ ہم سیتارام کے "کرشن باغ" میں، پکی پکی نارنگیاں اور گدراے ہوئے آم درختوں سے گرا گرا کر ٹوکریوں میں جمع کر رہے تھے تم نے یکایک مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں مضم کر جانے کی ٹھان لی اور میں چوڑیاں بھرتا ہوا، نورانی فرشتوں کے آتشیں گرز کی حیات شکن زد سے بہت دور، ناگ بھنی کے اُس پار جا بھلا۔ جاڑوں کی ایک ٹھنڈی ددپہر کو میں عثمان ساگر کے رومان آفریں کنارے مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا میری آہنی گلوں پر موت کا ہیبت ناک رقص تمہارے لئے ناقابل برداشت تھا، میرے فلک شگاف تہقے، تمہارے ہمدردی آمیز دشنام کا جی بھر کے مضحکہ اڑا رہے تھے۔ عثمان ساگر کی بقیاب موجیں بڑی بڑی چٹانوں سے گزر گزر کر ہماری جانب دوڑتی چلی آرہی تھیں اور میرے پاؤں پر گر کر کے رحم کی طلب گار رہی تھیں۔

میں لا ا بالیا نہ انداز سے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے ہوئے پاس کے جھوٹے کی طرف بڑھ گیا اور بڑے بڑے پینگ لینے شروع کئے۔ جھولا، آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور تم خوف کی انتہائی حالت میں سر سے پاؤں تک ایک دلفریب لرزش اور سراپا استدعا بنی ہوئی، میری ختم نہ ہونے والی شرارت پر جھلا رہی تھیں۔ ایک خاموش رات، تم اور میں، ڈرائنگ روم کے محلی نیلگوں قالین پر، بالکل تنہا پچھلی کھیلے ہوئے عجیب عجیب بازیاں بدرہے تھے۔ تم ہلکے نیلے لباس میں ملبوس تھیں اور میں ہلکے نیلے رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے نیلے آراستہ صوفوں، نیلے برقی قمقموں، پھول کے نیلے گلدستوں، کمرے کی نیلی دیواروں اور سیپ میں کھدی ہوئی نیلی تصویروں کی خاموش گویائی کے مزے لوٹ رہا تھا۔

یہ کوئی تین سال پہلے کا واقعہ ہے، جب میں زندہ تھا اور تمہارے غرور سنوانی سے مغلوب، تم میرے خلاف عادت مجھے تاش او کچھسی کھیلنے پر مجبور کرتیں اور میں اس جانب متوجہ ہو جاتا۔ تم میرے ہمراہ کھیتوں میں چہل قدمی ہکے لئے نکل جاتیں اور میں آنے والے امتحان اور شکسپیر، ملٹن اور براؤننگ کی غضب آلود حکیموں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آپ کو فطرت کی رنگینیوں پر نثار کرنے لگتا۔

گمر آہ — ع

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں !

انسانی زندگی، متضاد کیفیتوں کا دوسرا نام ہے، اب تم، میرے لئے ایک ایسا افسانہ ہو جس کا دلفریب عنوان میرے دماغ سے نکل چکا ہے اور اُس کے نقشہ اوراق تمہاری متلون طبیعت کی زہرہ شکن تاریکی میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گئے۔



میری زندگی، مجھے اب اُس جہاز کی مانند نظر آتی ہے جس نے ابدی سکون کی حالت میں ساحل چھوڑا تھا لیکن منزل سے کچھ دور سمندر کی تلاطم خیز موجوں نے اُس کے خلافت علم بغاوت بلند کر دیا اور وہ ان کی اس بازی گری کا ذرا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔

حضرت میر کا سوز و گداز اور شبلی کی سوگواری، تمھاری انتہائی کوشش کے باوجود مجھ جیسے خوش باش انسانوں پر قابو نہیں پاسکتی۔ اب میں جارج برنارڈشا، منڈبرک، اور علامہ اقبال کی ہمراہی میں آدمی رات کا چراغ جلایا کرتا ہوں اور میرے دماغ میں ایک لمحہ کو بھی تمھارا خیال نہیں گزرتا۔ دنیا مجھے اب بھی تمھارے نام سے منسوب کرتی ہے لیکن میں انتہائی لاپرواہی کے ساتھ اپنے کان اس طرف سے پھیر لیتا ہوں اور یہ ہے میرا آخری فیصلہ جو تم کو سنانا چاہتا ہوں۔

مگر

یہ بھی جانتا ہوں، مجھے اپنے اس عزم پر قائم رہنے کے لئے کن روح فرسا اذیتوں میں مبتلا ہونا پڑیگا۔ اچھا تو آؤ، جانے بھی دو، کہاں کا فیصلہ اور کیسا عزم۔

رہے آزر دہم اس شوخ سے چندے تکلف سے  
تکلف بر طرف، تھا ایک انداز جنوں یہ بھی۔

مرزا سرفراز علی حیدر آبادی

حکم قرار دئے جانے دیوالیہ۔ (دفعہ ۲۷-۱ ایکٹ ۵ سنہ ۶)

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب حج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۳ سنہ ۶

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی

مبلاقی ولد پتو قوم خاکروب ساکن محلہ فراشن خانہ مصطفیٰ منزل تھانہ چوک لکھنؤ

مبلاقی کی درخواست دیوالیہ مورخہ ۳۱ جنوری سنہ ۶ کو پڑھنے اور فریقین کے بیانات کو سننے کے بعد یہ حکم دیا جاتا

کہ مریون مذکور دیوالیہ قرار دیا گیا اور وہ ۶ ماہ کے اندر اپنی درخواست بریت گزرانے۔

المرقوم ۱۸ اپریل سنہ ۶

حکم عدالت۔ بشمبہ پال منہم عدالت حج خفیفہ لکھنؤ



# مطبوعات موصول

**فاتح مصر** حضرت عمرو بن العاص کے سوانح حیات ہیں جنہیں مولوی امام الدین صاحب رام نگری نے مرتب کیا ہے۔ سیاسیات اسلام کی تاریخ میں جناب عمرو بن العاص کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو دوسری قوم میں کسی بڑے سے بڑے فاتح یا سپہ سالار کا ہو سکتا ہے اور جس وقت تک متحضر و طرابلس کا وجود کرہ ارض پر باقی ہے، ان کی یاد کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آپ فطرتاً حد درجہ غیور و جری پیدا ہوئے تھے، اسی لئے جب تک مسلمان نہ ہوئے تھے وہ اسلام کے سخت خطرناک دشمن رہے اور جب اسلام قبول کر لیا تو پھر اُسی شدت و انتہاک کے ساتھ وہ اس کے مددگار و معاون بھی ثابت ہوئے۔

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو بطل پرستی رکھتی ہو (مگر یہی سبب ہے) کے جذبات سے خالی ہو اور اس میں شک نہیں کہ اکثر اقوام عالم کے عروج و ترقی کا سبب یہی جذبہ ہوا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں قوتِ عمل مفقود ہو جانے سے، یہی جذبہ بچائے مفید ہونے کے معصرت رساں ثابت ہوا اور انھوں نے اسلام کے کارناموں کو اپنے موجودہ زوال و انحطاط کا کفارہ سمجھنے کے علاوہ خود اپنے اندر ہی قوتِ عمل پیدا کرنے کی کوشش کی نہیں کی بہر حال مولوی امام الدین صاحب کی یہ سعی یقیناً قابلِ قدر ہے اور وہ حضرات جو مختصر الفاظ و صفحات میں اس فاتح مصر کے کمالات و کیفیات چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کافی ہے۔ دس آنے اس کی قیمت ہے اور مسلم اکاڈمی پبلیواری شریف سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

Hyderabad. { حیدرآباد میں ایک انجمن جمعیت رعایائے نظام کے نام سے قائم ہوئی ہے جو ملکی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے غالباً

سب سے پہلی منظم جماعت ہے۔ اس جماعت نے حال ہی میں ایک سرکلر کے ذریعہ سے اپنے مقاصد و مطالبات کا اعلان کیا تھا اور اب کسی حیدرآبادی بزرگ سید عابد حسین صاحب نے ان تمام مطالبات کی تفسیر و تشریح انگریزی زبان میں اس نام سے شائع کی ہے۔



حیدرآباد میں ملکی تحریک تقریباً ایک رُبع صدی پہلے شروع ہوئی تھی، لیکن تعلیم کم ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی قوت نہ تھی، لیکن اب کہ جامعہ عثمانیہ کے وجود نے وہاں عام تعلیمی ذوق پیدا کر دیا ہے اور ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان بیکاری کے غدا میں مبتلا ہیں، اس تحریک کا قوی ہونا بالکل فطری امر ہے اور کوئی صاحب فکر ایسا نہیں جو اس کو مستحسن نگاہوں سے نہ دیکھے۔ حیدرآباد کی سرزمین سے فائدہ اٹھانے کا حق یقیناً سب سے پہلے وہیں کے بسنے والوں کو پہنچتا ہے اور اگر ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے تو اس کا محو کر دینا آسان نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب اس نوع کی تحریک کسی ملک میں پیدا ہوتی ہے تو غیر ملکی جماعت کو ضرور نقصان پہنچتا ہے، لیکن دنیا میں ایک کے فائدہ کی بنیاد ہمیشہ دوسرے کے نقصان ہی پر قائم ہوتی ہے اور اس تصادم سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔

میں چونکہ ہر سال حیدرآباد جاتا ہوں اس لئے مجھے معلوم ہے کہ وہاں اس وقت ملکی و غیر ملکی لوگوں کے درمیان کتنی مغایرت پیدا ہو گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس جنگ میں اہل ملک کامیاب ہوں گے اور انھیں پورا چاہئے، لیکن جس وقت خود اندرون ملک کی آبادی اور اس کے حالات پر غور کیا جاتا ہے تو ہم یہ سمجھنے پر بھی مجبور ہیں کہ اب نہیں تو کل وہ وقت ضرور آئے گا جب یہی ملکی تحریک خالص فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرے گی اور پھر خود ملکی جماعتوں کے اندر کشمکش شروع ہو کر سوال ملکی و غیر ملکی کا نہیں بلکہ ہندو مسلمان کا رہ جائے گا۔ حیدرآباد کے مسلمانوں کے سامنے تو یقیناً صرف یہ سوال ہے کہ حکومت کے نظم و نسق اور دفتروں کی ملازمت میں ان کو کیوں پورا حصہ نہیں دیا جاتا اور اگر ان کا یہ مطالبہ پورا ہو جائے تو پھر غیر ملکی لوگوں سے ان کو یہ فائدہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن وہاں کے ہندوؤں کے سامنے اس سے زیادہ اہم سوال مسلم و غیر مسلم حکومت کا ہے۔ یعنی جس طرح وہاں کے مسلمان، طبقہ عمال میں اپنی اکثریت دیکھنا چاہتے ہیں، اسی طرح ہندو بھی یہی تمنا اپنے دل میں رکھتے ہیں اور اگر حکومت کبھی اس بات پر مجبور ہوئی (اور یقیناً ہوگی) کہ وہ اہل ملک کے اس مطالبہ کو پورا کرے تو وہ یقیناً اس پر بھی مجبور کی جائے گی کہ مناسب آبادی کے لحاظ سے فیصلہ کرے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ غیر ملکی مسلمانوں کے ساتھ ملکی مسلمانوں کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ بہر حال جس حد تک صرف اصول انصاف کا تعلق ہے، کوئی شخص حیدرآبادیوں کے اس جذبہ کو برا نہیں کہہ سکتا، لیکن وہاں کے مسلمانوں کو یہ بھی سوچ لینا چاہئے کہ اگر آئندہ کسی وقت ہندوؤں نے اپنا حقیقی مطالبہ پیش کیا (اور یقیناً پیش کریں گے) تو کیا وہ اس وقت اسی خاموشی و فیاضی کے ساتھ حکومت کا



تمام نظم و نسق ہندوؤں کے ہاتھ میں دینے کے لئے طیار ہو جائیں گے، جس خاموش و فیاضی کی توقع وہ اس وقت غیر ملکی مسلمانوں سے رکھتے ہیں؟۔ اگر وہ انصاف و رواداری کے اس اصول پر کاربند ہونے کے لئے طیار ہیں تو بیشک ان کی یہ تحریک ہر طرح قابل تبریک و ستائش ہے، لیکن اگر آگے چل کر اپنی اقلیت کو اکثریت آبادی کے مقابلہ میں اہم بنانا ناگزیر ہے تو وہ غیر ملکیوں کی مخالفت کر کے کیوں اُس حلیف کی اعانت سے اپنے آپ کو محروم کرنا چاہتے ہیں جس کی امداد حاصل کئے بغیر وہ آئندہ جنگ میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتے۔

معلوم نہیں اس مسئلہ کا یہ نازک پہلو مسلمانانِ حیدر آباد کے سامنے ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ اس آنے والے سیلاب کے مقابلہ کے لئے کیا طیاریاں کر رہے ہیں۔ کیا صرف یہی کہ غیر ملکیوں کو حیدر آباد سے نکال دیا جائے یا آئندہ اُن کو حیدر آباد آنے سے باز رکھا جائے؟ اور اگر انھوں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے تو پھر سوائے اس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔ تو سرگناہ کہ خواہی لیکن کہ معذوری۔

**قرآن آموز** تالیف ہے جناب نذیر بن ابی سلمیٰ کی جنہوں نے قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھنے کا طریقہ اس کتاب میں بتایا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں میں بلا سمجھے بوجھے قرآن پڑھنے کی عادت قبیحہ بہت عام ہے اور ضرورت ہے کہ اہل علم و مذہب اس طرف متوجہ ہوں۔ لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے کہ شروع ہی سے بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جائے، البتہ جب مادری زبان کی تعلیم سے فارغ ہو کر ان میں کچھ عقل پیدا ہو تو بیشک قرآن کیا بلکہ قرآن کی تعلیم ان کو متوجہ کرنا چاہئے اور یہ بغیر مطلب سمجھے ہوئے ممکن نہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ قابل مولف نے جو طریق تعلیم اس کتاب کے ذریعہ سے پیش کیا ہے وہ بہت پسندیدہ ہے اور ملک میں اس کو مقبول ہونا چاہئے۔ یہ پہلا حصہ ہے اور دفتر قرآن آموز احاطہ شہزاد محمد طاہر۔ لدھیانہ سے چار آنہ میں مل سکتا ہے۔

**احیاء الامم** شمس العلماء خان بہادر حافظ نذیر احمد مرحوم کی نہایت مشہور تالیف ہے جو کسی پادری کے جواب میں انھوں نے لکھی تھی، لیکن صرف اس لئے کہ انھوں نے اس میں اپنی خالص دہلوی زبان استعمال کی تھی مولویوں نے اس کو جلائے بغیر چھوڑا۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، لیکن اب مسٹر شاہد احمد ڈیڑھ ساقی نے جو حافظ نذیر احمد مرحوم کے پوتے ہیں اس کو پھر شائع کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان اعتراضات کے جوابات بھی شائع کر دئے ہیں جو اُن وقت



صاحب احسن التفاسیر نے دئے تھے۔ اس کتاب میں رسول اللہ کی ازدواجی زندگی سے بحث کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض مقامات پر حد درجہ جرأت سے کام لیکر ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جن کو مولویوں کی عام جماعت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی قیمت دو روپیہ ہے اور دفتر ساقی دہلی سے مل سکتی ہے۔

**دیوان معروف** تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر دہلوی کے شاگردوں میں ایک صاحب نواب الہی بخش بھی تھے جو معروف تخلص کرتے تھے۔ لیکن ان کا دیوان دستیاب ہونا تھا

شاہ عبدالحمید صاحب قادری کو اتفاق سے اس کا ایک نسخہ حیدرآباد میں مل گیا اور انھوں نے شایع کر دیا۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں معروف کے سوانح حیات بھی ہیں اور کلام پر ہلکا سر تبصرہ بھی۔ ہر چند معروف کا کلام تغزل کے لحاظ سے کوئی خاص چیز نہیں، تاہم اس کے شایع ہو جانے سے یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ مذکورہ نالیوں اور نقد کرنے والوں کو اب سے پورے دو سو سال کی شاعری اور اس وقت کی زبان کے نمونے تلاش کرنے میں اور زیادہ آسانی ہو جائے گی۔ طباعت و کتابت اچھی ہے، اور یہ قیمت۔ طے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں۔

**علاج بہ ریڈیم** رسالہ ہے لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق کا جو تجدید شباب کے باب میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، اس سے قبل آپ کے متعدد رسائل اس موضوع پر شایع ہو چکے ہیں اور نگار

میں ان پر تبصرہ بھی ہو چکا ہے اس رسالہ میں آپ نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے کہ ریڈیم کے ذریعے سے اعادہ شباب کس حد تک ممکن ہے۔ رسالہ کی قیمت ۴ روپے اور ڈاکٹر موصوف سے قلعہ گو لکنڈہ حیدرآباد کے پتے پر مل سکتا ہے۔

**رہنمائے تعلیم کارڈکراس نمبر ۱** ماسٹر جگت سنگھ رہنمائے تعلیم کے مالک و ایڈیٹر ان لوگوں میں سے ہیں جو کامیابی کی جستجو صرف سعی و عمل میں کرتے ہیں اور جب تک مقصود حاصل

نہ ہو جائے چین سے نہیں بیٹھتے۔ یونہی سرزمین پنجاب کا ہر فرد اس باب میں ہمارے صوبہ کے لوگوں سے ممتاز نظر آتا ہے، لیکن ماسٹر صاحب موصوف اس عزم مردانہ میں جو غیر معمولی خصوصیت رکھتے ہیں، وہ بہت زیادہ واضح و روشن ہے۔ اس سے قبل انھوں نے اپنے رسالہ کا جو بی نمبر نکال کر اپنی قوت عمل کا جو زبردست ثبوت دیا تھا اسکی مزید توثیق اب رڈکراس نمبر سے کی گئی ہے، جو اس موضوع پر اپنی جامعیت کے لحاظ سے اردو زبان میں بالکل پہلی چیز ہے۔ وہ حضرات جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ اشاعت از بس مفید و دلچسپ ہے اور اگر رڈکراس کی تحریک صرف اس لئے قابل نفرت نہیں ہے کہ اس کو صلیب کے نسبت حاصل ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے عام دلچسپی لپیٹا۔

**مسرود زندگی** جناب اصغر گونڈوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس پر ہم کسی آئندہ صحبت میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کریں گے۔



# باب المراسلۃ والمناظرۃ

## اختر یگانہ سے

مارچ کے مکار میں آپ کی تحریر شائع کرنے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ جس موضوع پر جناب بزمی اور ڈاکٹر الیاس صاحب نے اظہار خیال کیا ہے، اس کے ایک ضمنی پہلو پر گفتگو کرنے کا موقع مجھے بھی مل جائے۔ نیز یہ کہ اگر آپ کو آپ کے موجودہ مشکلات سے نکالنے کے لئے کسی مشورہ کی ضرورت ہے تو کم از کم میری طرف سے تو آپ کو یہ یقین ہو ہی جائے کہ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن آپ کی تحریر کو شائع ہونے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ استفسارات کی کثرت نے ایک تیسرا مسئلہ اور میرے سامنے پیش کر دیا اور وہ یہ کہ آیا کسی ایسی عورت کی تحریر شائع کرنا (جو آپ جیسا خوبصورت نام رکھتی ہو جس کا ذوق ادب آپ جیسا دلچسپ ہو اور پھر ایسے طبقہ سے بھی تعلق رکھتی ہو جو مادی ذرائع کی دسترس سے دور نہیں ہے) کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو "مقدار بادہ" اور "ظرف قدح خوار" کی نسبت پر غور کرنا میرے لئے ضروری ٹھہرے۔

باور کیجئے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جہاں سے یہ مطالبہ مجھ سے نہ کیا گیا ہو کہ میں بتاؤں آپ کون ہیں، آپ کا کیا پتہ ہے اور آپ کی ہستی کوئی فرضی ہستی تو نہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ دنیا کے اس جذبہ "قسمت آزمائی" کی تسکین مجھ سے کیونکر ممکن ہے، جبکہ حقیقتاً خود میں بھی اس باب میں یکسر استفسار و استفہام (۶) بنا ہوا ہوں۔

جتنے خطوط استفسار حال کے لئے موصول ہوئے ہیں، ان کے لکھنے والوں کی نیت کے متعلق یقیناً مجھے رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں اور نہ یہ باور کرنے کا کوئی سبب موجود کہ انسانی ہمدردی کے علاوہ کوئی اور جذبہ ان کے اندر کار فرما ہے، لیکن میں یہ سمجھنے پر ضرور مجبور ہوں کہ اگر اسی بیکیسی و بیچارگی کا اظہار کسی مرد کی طرف سے ہوتا تو شاید کسی کے کان پر جوں تک نہ ٹپکتی اور نفسیات انسانی کا یہی وہ پہلو ہے جو کبھی کبھی مجھے



یہ غور کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ عورت کی اس افوائے مظلومیت ہی نے مرد کو ستم رانی پر آمادہ کیا ہو۔ وہ ستم رانی جو مظلوم سے زیادہ ظالم کو تباہ و برباد کرنے والی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی عورت کا معصیت کے خیال سے گھر اکرو معصیت سے بچنے کا اعلان کرنا بجائے خود اتنی بڑی دعوتِ معصیت ہے کہ شکل ہی سے کوئی مرد اس سے بچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ علی الخصوص اس وقت جب یہ بھی نہ معلوم ہو کہ یہ صدائے لنترا نی گدھر سے آرہی ہے۔ شمع سے زیادہ کسوتِ شمع پر دانوں کی بتیابی کا سبب ہوا کرتی ہے اور نقاب و حجاب جلوہ عریاں سے زیادہ مار رکھنے والی چیز ہے۔ اس لئے۔ اگر وہ صحیح ہے جو مارچ کے نگار میں آپ نے تحریر کیا ہے اور آپ اپنی موجودہ زندگی سے واقعی بیزار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ایک بار ہمت و جرات سے کام لیکر سامنے نہ آجائیں۔ اور ایک بار اس غبس کے افراد کو تلافی کا موقع نہ دیں، جس کی طرف سے آپ لبرل شکایت ہیں۔ یہ ہے میری ذاتی رائے اس باب میں جس پر اگر آپ نے عمل کیا تو ممکن ہے میں اور میرے ساتھ بعض وہ افراد جو اس مسئلہ کی عمرانی اہمیت سے واقف ہیں کوئی تدبیر علاج دھاوا کی اختیار کر سکیں ورنہ ظاہر ہے کہ آپ کی طرف سے سلسلہ احتجاج اور دوسری طرف سے دلولہ بھدر دی دونوں بے سود ثابت ہوں گے اور آئندہ میں نگار کے صفحات کو صرف ”جولانگاہِ عشق“ بنانا کبھی پسند نہ کروں گا۔

## مہدی و مہدویت کے باب میں

جناب ابورشید صاحب (حیدر آبادی) سے

مکرمی — آپ کی تحریر جس میں آپ نے جناب سید محمد صاحب جو پوری کی مہدویت کے متعلق مختصر اظہارِ عقیدت و ارادت کرتے ہوئے اہل تسنن کے عقیدہ ظہور مہدی کو بہ حوالہ کتب عقاید اہل تسنن ثابت کرنا چاہا ہے، پہونچی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں آپ کی تحریر بجنسہ شائع کر دیتا اور اس کا جواب دیتا اگر اس کی ضرورت ہوتی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اور میرا ایسا نہ کرنا اس بنا پر نہیں ہے کہ آپ نے جو اندازِ مخاطب اختیار کیا ہے، وہ حد درجہ غیر مہذب و ناشائستہ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اس کا طرز انشاء و استدلال نہایت غیر دلچسپ اور ناقابل برداشت حد تک فرسودہ و پامال ہے۔ جو اب یہ ظاہر کے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ آپ نے جو حجت اپنی تحریر میں پیش کی ہے



اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اہل تسنن کے یہاں مہدی موعود کا عقیدہ کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے آپ نے اپنی تحریر کی ابتدائی چند سطروں میں لکھا ہے کہ نہ جناب سید محمد صاحب جو نہ پوری نے کبھی دشمنوں کے خون سے تقیہ کیا اور نہ اس وقت مہدوی جماعت تقیہ کی عادی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا صحیح و درست ہو لیکن اس کے بعد پورے چار صفحات اس کوشش میں سیاہ کر دینا کہ ظہور مہدی کا عقیدہ اہل تسنن کے یہاں کوئی اہمیت رکھتا ہے، البتہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

آپ نے اپنے استدلال میں ایک قول تفازانی کا شرح مقاصد سے نقل کیا ہے اور دوسرا بیہقی کا شعب الایمان سے۔ اس کے بعد آپ نے پورے تین صفحات اس بحث کے لئے وقف کئے ہیں کہ علامہ ابن خلدون نے جن احادیث پر نقد و جرح کر کے ظہور مہدی کے عقیدہ کو ناقابل تسلیم قرار دیا ہے وہ احادیث بالکل صحیح ہیں اور ابن خلدون نے جو کچھ لکھا ہے غلط لکھا ہے۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے دلائل کی طرف متوجہ ہوں، یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ آپ کسی جماعت کے کسی عقیدہ کی اہمیت اس وقت تک ثابت نہیں کر سکتے، جب تک جمہور اکابر علماء کا اس پر اتفاق نہ ہو کیونکہ جب تک ادنیٰ اختلاف بھی کسی عقیدہ میں پایا جاتا ہے اس وقت تک وہ ہر زمانہ میں نقد و تحقیق کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر شخص آزاد ہے کہ اس کو اپنے استنتاج کے لحاظ سے تسلیم کرے یا مسترد کر دے۔

اب آپ خود اپنے پیش کردہ منقولات پر غور کیجئے کہ ان سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ سعد الدین تفازانی کے الفاظ یہ ہیں:۔

ذہب العلماء الی انہ امام عادل من ولد فاطمۃ

الفاظ (ذہب العلماء) کا مفہوم ہی صریح یہ ہے کہ بعض علماء کی رائے یہ ہے اور کہنے والا خود اسکو ضعیف تسلیم کرتا ہے۔ رہ گئے بیہقی سوانحوں نے شروع ہی میں ظاہر کر دیا ہے کہ۔ (اختلف الناس فی امر المہدی)

علامہ ابن خلدون نے مہدی موعود کی جن احادیث کو ناقابل اعتماد ظاہر کیا ہے، ان کے راویوں کو آپ نے حد درجہ قابل اعتماد قرار دیا ہے اور اپنی تائید میں تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال کا حوالہ بھی دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ کی یہ کاوش بھی کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہنچتی کیونکہ جس طرح آپ کے نزدیک یہ کتابیں معتبر ہیں اسی طرح کسی اور کے نزدیک ابن خلدون کی تحقیق قابل وثوق ہو سکتی ہے اور اس امر کا فیصلہ کہ ان دونوں میں صحیح کون ہے چندال و شوار نہیں۔ وہ لوگ جو ظہور مہدی کی احادیث کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں ان کا استدلال صرف



یہ ہے کہ ان حدیثوں کے راوی معتبر ہیں اور اصول و روایت کی طرف مطلق اعتناء نہیں کرتے، لیکن ابن خلدون وغیرہ جو اس عقیدہ کے منکر ہیں وہ روایات و درایات دونوں طرح اس قسم کی احادیث کو مجرد ثابت کرتے ہیں اور اس لئے ایک تیسرا شخص جو راویوں کے ثقاہت و عدم ثقاہت کے متعلق اختلاف رائے سے گھبرا کر کسی نتیجہ تک پہنچنا چاہے وہ مجبور ہو گا کہ ابن خلدون کے قول کو صحیح یا در کرے کیونکہ درایت بہر حال درایت ہے اور عقل انسانی اس کے احکام تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ جتنی احادیث پیشین گوئیوں کی رسول اللہ سے منقول ہیں اول تو وہ یوں بھی اصولاً زیادہ قابل وثوق نہیں سمجھی جاتیں، چہ جائیکہ ظہور مہدی کی احادیث جن کے وضع کرنے کے لئے کھلے ہوئے سیاسی اسباب موجود تھے۔

جس طرح یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ امویین و عباسیین نے علویین کے مطالبات کو ضعیف اور ان کے اثرات کو کمزور بنانے کے لئے بکثرت احادیث وضع کیں، اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ علویین نے خاندان بنی فاطمہ کے استدلال کے لئے کافی سعی سے کام لیا اور اس سلسلہ میں منجملہ دیگر تدابیر کے ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ امام متظر اور ظہور مہدی کی پیشین گوئیاں رسول اللہ سے منسوب کر کے اپنے حق خلافت و امارت کو مضبوط کیا گیا۔

میں نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ ظہور مہدی کا عقیدہ اہل تسنن کی کتابوں میں کہیں نظر ہی نہیں آتا بلکہ صرف یہ لکھا تھا کہ اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت ان کے یہاں حاصل نہیں ہے اور اس عدم اہمیت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ہمیشہ اس مسئلہ میں باہم اختلاف رہا اور اجتماعی حیثیت سے کبھی اس کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ بر خلاف اہل تشیع کے یا مہدیین کے کہ ان کے یہاں متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ظہور مہدی ضروری ہے اور اگر ان دونوں جماعتوں میں کوئی اختلاف ہے تو صرف یہ کہ ایک کے یہاں (جناب سید محمد صاحب جوہوری کی صورت میں) ظہور ہو چکا ہے اور دوسری جماعت کے یہاں امام متظر ہنوز پردہ خفا میں ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب رونما ہو

جناب محشر عابدی کے منتخب افسانوں کا مجموعہ جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر پہلک سے

محشر تان

کافی خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت مجلد عام غیر مجلد عام علاوہ محصول

جناب سید محمود اعظم فہمی تہذیبی کی ادبی، اخلاقی، نظموں اور غزلوں کا منتخب مجموعہ

شعر تان

معہ جگر مراد آبادی کے مختصر تبصرہ اور جناب منظور سرور شش بھر پالی کے مقدمہ کے

منیجر نگار لکھنؤ

۲۰ x ۳۰ کے ۱۲۰ صفحات قیمت ۷ علاوہ محصول



# باب الاستفسار

## الف لیلہ اور سند بادنامہ

(جناب مراد علی صاحب - پٹنہ)

براہ کرم مطلع فرمائیے کہ کیا سند بادنامہ اور الف لیلہ دو علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں، اگر علیحدہ ہیں تو الف لیلہ اور اس کی ترتیب میں کیا اختلاف ہے، خود الف لیلہ میں سند باد کا ذکر موجود ہے اس لئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

(نگار) یقیناً دونوں کتابیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں اور ہر چنانچہ ان کی ترتیب میں ایک نوع کی مماثلت ضرور پائی جاتی ہے لیکن دونوں کو ایک نہیں کہہ سکتے۔

سند باد نامہ کا قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے لڑکے کی تعلیم ایک حکیم سند باد کے سپرد کرتا ہے اور سند باد اس کو ہدایت کرتا ہے کہ سات دن تک خاموش رہے، اسی زمانہ سکوت میں بادشاہ کی محبوب ملکہ اپنے سوتیلے بیٹے یعنی شہزادہ کے خلاف نہایت سخت الزامات قائم کرتی ہے اور بادشاہ اس کے قتل کا حکم نافذ کرتا ہے لیکن بادشاہ کے مات وزیر ہیں اور ان میں سے ہر ایک روزانہ ایک ایک قصہ کہہ کر تعمیل حکم کو ملتوی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ آٹھویں دن جب شہزادہ کا سکوت ختم ہوتا ہے تو وہ الزامات کو دور کرتا ہے اور بیگناہ ثابت ہوتا ہے۔ الف لیلہ میں ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ایک بادشاہ روز نئی عورت سے نکاح کرتا ہے اور صبح کو اسے قتل کر دیتا ہے لیکن جب شہزادہ سے اس کا نکاح ہوا تو اس نے روز رات کو ایک کہانی سنانی شروع کی اور اس کو صبح تک ناتمام چھوڑ کر ایک ایک دن کی جاں بخشی حاصل کرتی رہی، یہاں تک کہ ہزار راتیں اسی طرح بسر ہو گئیں اور اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے رشتہ اُلفت کو اور زیادہ استوار کر دیا اور اس طرح بادشاہ کی یہ مذموم عادت ترک ہو گئی۔



اسی نوع کا افسانہ بختیار نامہ کا ہے جس میں دس وزیر شاہزادہ پر الزام قائم کرتے ہیں اور وہ قصے سناسنا کر اپنی بیگناہی ثابت کرتا ہے۔ طوطی نامہ بھی اسی انداز کا ہے۔

مسعودی نے الف لیلة کے ذکر میں سندباد نامہ کا بھی ذکر کیا ہے، اور ہر چند بعد کو یہ دونوں کتابیں ملاوی گئیں لیکن سندباد نامہ کا وجود الف لیلة سے حقیقتاً بالکل علیحدہ اور زیادہ قدیم العہد تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ سندباد نامہ قدیم ہندی افسانہ سدھ پٹی سے ماخوذ ہے، لیکن اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سدھ پٹی کا وجود کہیں نہیں پایا جاتا۔ علاوہ اس کے سات دن تک خاموش رہنے کا ٹکڑا ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایات فیثاغورس سے ماخوذ ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔

## انار کی اور انارکزم

(جناب سید ابوالصغر صاحب - ہوشنگ آباد)

انار کی و انارکزم میں کیا فرق ہے، اس کی تحریک کب اور کس نے کی اور اس کے مقاصد کیا ہیں۔

(نگار) انارکزم جسے عربی میں (فوضویت) کہتے ہیں ایک ایسی اشتراکیت پسندی ہے جو نہ صرف انقلاب حکومت کی آرزو مند ہے بلکہ وجود حکومت کو بھی دنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے۔ اور انار کی سے مراد سوسائٹی کی وہ حالت ہے جو انارکزم سے پیدا ہوتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انارکزم کا تعلق اصول و عقیدہ سے ہے اور انار کی کا حالت و کیفیت سے۔

فوضویت میں اشتراکیت پسندی کی شان پیدا کرنے والا سب سے پہلا شخص فرانس کا پراؤڈن (Proudhon) تھا۔ جو ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۵ء میں مرا۔ یہ نوع انسان میں انفرادی آزادی کا بڑا موید تھا اور کہا کرتا تھا کہ انسان پر انسان کا حکم ال ہونا انسانیت کی حد درجہ توہین ہے اور آزادی خیال و ضمیر کو محو کر دینے والی ہے۔ اسی لئے وہ ایک ایسے معاشری نظام کا خواہشمند تھا



جس میں حکومت تو کسی کی نہ ہو، لیکن ہر شخص اپنی اپنی جگہ اصول و قاعدہ کا پابند ہو کر زندگی بسر کرے، اور انسانی ارتقاء کی یہی آخری حد ہے۔

اس کے بعد اس خیال کا سب سے بڑا حامی و مبلغ باکونن (Bakunin) ہوا اور پھر کروٹسکین (Kropotkine) یہ دونوں روس کے باشندے تھے۔

اس تحریک کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ انسانوں کو مکمل آزادی ملنا چاہئے اور حکومت خواہ وہ شخصی ہو یا جمہوری مٹنا چاہئے، کیونکہ حکومت بہر حال حکومت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس سے نوع انسانی کو جسمانی یا ذہنی تکلیف نہ پہنچے۔ اس تحریک کے حامی زمین اور سرمایہ کو قوم کی مشترک ملکیت بنانا چاہتے ہیں اور تعلیم کو عام۔ وہ کہتے ہیں کہ جس وقت تمام افراد انسانی تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو فطری قوانین کو ہر شخص سمجھ کر ان پر عمل کرے گا اور کسی خارجی حکومت یا سیاسی تنظیم کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ باکونن کا قول تھا کہ سوسائٹی کے تمام قدیم اصول کو توڑ دینا چاہئے، کیونکہ ان کی موجودگی میں نہ تعلیم عام ہو سکتی ہے اور نہ انسان کو مکمل آزادی میسر آ سکتی ہے۔

الغرض فوضویت کے بڑے اصول صرف دو ہیں۔ ایک سیاسی اور دوسرا معاشری۔ سیاسی یہ ہے کہ حکومت کے وجود کو خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو فنا ہو جانا چاہئے اور معاشری یہ کہ سرمایہ و دولت کو ملک عام بنادینا چاہئے۔

اگر اس جماعت کے یہ اصول صرف علمی نظریے کی حیثیت تک محدود رہتے تو شاید دنیا ان کی طرف اعتناء بھی نہ کرتی، لیکن چونکہ انہوں نے حصول مقصود کے لئے قوت استعمال کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور وہ ہر قسم کی جنگ و مقادمت کے لئے تیار رہتے ہیں، اس لئے ہر زمانہ میں اس تحریک کی مخالفت کی گئی اور پوری غمتی کے ساتھ اس کو دبایا گیا۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی ترقی کا معیار یہی ہے کہ وہ قانون یا مذہب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو متکون ثابت کرے، یعنی دنیا میں امن و سکون کی حمایت اس لئے نہ ہونا چاہئے کہ قانون یا مذہب اس پر مجبور کرتا ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ انفرادی طور پر وہ ہر شخص کا فطری فرض ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ اگر آج دنیا کے تمام افراد اس مرتبہ تک پہنچ جائیں تو فردوسِ کم گشتہ ہم کو یہیں حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن جس حد تک عمل کا تعلق ہے ہم کو یہ خواہش خود اقتضائے فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور فوضویت کا



قانون فطرت کی آڑ پکڑ کو جنگ کرنا خود فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔

مرزد بوم کا اختلاف، آب و ہوا کا اختلاف، ماحول کا اختلاف اور سب سے زیادہ حوادث طبیعی کا ظہور۔ یہ تمام اسباب ایسے ہیں جن پر انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں اور ان سے انسان کے ذہن و دماغ کا متاثر ہونا بالکل غیر اختیاری امر ہے۔ اس لئے یہ نامکن ہے کہ وقت و احوال میں تمام انسان کسی ایک حالت پر متفق ہو سکیں اور سچ پوچھئے تو دنیا کی رونق اسی ہنگامہ و تضاد و دم پر قائم ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ایک خیال کو کسی ایک جماعت یا زیادہ سے زیادہ کسی ایک ملک کے لئے قابل قبول بنا سکیں لیکن تمام نوع انسانی کا اس پر متفق ہو جانا اقتضاء فطرت کے خلاف ہے۔ پھر چونکہ فوضویت کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نوع انسانی کے تمام افراد اس پر کار بند نہ ہو جائیں اس لئے اس تحریک کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور کبھی اس کی توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ عالمگیر کامیابی حاصل کر سکے گی۔

## بلیک ڈائمٹ

### ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اس وقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بہ کثرت نظر آتے ہیں، لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جلد پر دانے پڑ کر زخم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کر جاتا ہے، ہلاکتیں بھی ہو جاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی اور زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اسکے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر انکی چمک اور مضبوطی کو بھی قائم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے بھی نہیں آتے۔ قیمت علاوہ محصول چھوٹا بکس ۱۱ روپے، بڑا بکس ۱۵ روپے ایک شیشی میں محصول ۶ روپے ہو جاتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کی جائیں گی اتنا ہی فائدہ ہوگا۔

بڑے بڑے انجینیاں درکار ہیں۔ کمیشن کے متعلق خط کتابت کیجئے۔ کارخانہ خضاب بلیک ڈائمٹ لکھنؤ



# حسن گریزاں سے

مرے سروناز ! ابھی نہ جا !

مرے دلنواز — ابھی نہ جا !

نہ ابھی سے پھر نگاہ تو میں نگاہ بھر کے تو دیکھ لوں  
ترا پیار ہے مری زندگی تجھے پیار کر کے تو دیکھ لوں  
تو قرار دل ہے — ذرا ٹھہر میں ذرا ٹھہر کے تو دیکھ لوں

ابھی دل کی پیاس بھی نہیں

خلش امید مٹی نہیں

کوئی دیر بھی تو ہوئی نہیں

یہ سکوں، یہ فرصت آرزو! یہ شبِ دراز — ابھی نہ جا

مرے سروناز ! ابھی نہ جا

مرے دلنواز — ابھی نہ جا

ابھی ماہتاب ہے چرخ پر تجھے، ماہتاب نہ دیکھ لے  
ہے یہ سوچ — نیلی شب کہیں؟ تجھے، بے نقاب نہ دیکھ لے  
پس پردہ، کوئی چھپا ہوا تجھے بے حجاب نہ دیکھ لے

کہیں، قدسیوں میں نہ گل گھلیں

کہیں، ککشاں کے نہ پر گلیں

ترے نقشِ پا کی تلاش میں

کہیں، کھل نہ جائے نجوم پر یہ حسین راز! — ابھی نہ جا

مرے سروناز ! ابھی نہ جا

مرے دلنواز — ابھی نہ جا

جو کبھی کسی نے سنی نہ ہوں وہ کہانیاں میں سناؤ گگا  
جو نشاطِ روح بہشت ہوں میں وہ گیت، خلد لاؤنگا  
یہی شب ہے حالِ صدحر اسے لازوال بناؤں گا  
کبھی نغمہ بار رہوں گا میں  
کبھی گل طراز بنوں گا میں

تجھے دیکھ دیکھ جیوں گا میں

لیٹی خوابِ خلد نما رہے۔ یونہی، خلد ساز! ابھی نہ جا!

مرے سروناز ! ابھی نہ جا

مرے دلنواز — ابھی نہ جا

جو بسی ہے تیرے خیال سے اُسی کائنات کا واسطہ!  
تجھے — آہ! جس سے گریز ہے اُسی التفات کا واسطہ!  
غم بے ثبات نہ دے مجھے کششِ حیات کا واسطہ!  
جو مراد اشکِ چکیدہ ہو !

جو قرارِ جانِ رمیدہ ہو !

وہ دلِ روش سے کشیدہ ہو !

جو نیازِ شوق سے ضد ہے کچھ اتو، پیاسِ ناز! — ابھی نہ جا!

مرے سروناز ! ابھی نہ جا!

مرے دلنواز — ابھی نہ جا!

مجھے اب بھی وہمِ فراق ہے "عجیبِ ہم" مٹا بھی دے  
ابھی ہوشِ شاملِ کیف ہے یہ حجابِ ہوش اٹھا بھی دے  
جو بسے ہیں تیری نگاہ میں وہی خوابِ بھکو دکھا بھی دے

مرادِ جمالِ نما — بنے

مراہرِ خیال — بقا، بنے

"ترا عشق" — میرا خدا بنے

چمن بقیں میں کھلا بھی دے۔ "گلِ امتیاز" — ابھی نہ جا

مرے سروناز ! ابھی نہ جا

مرے دلنواز ! ابھی نہ جا



# شاہکار

ہوئی روزِ ازل تخلیق جب آدم کے پیکر کی  
فرشتے سر بسجود ہو گئے ایمائے فطرت پر  
مگر منشاءِ فطرت کی ابھی تکمیل باقی تھی  
صدائے آئی ہمیں اک یا سمیں پیکر بنانا ہے  
اسے ترتیب دو، صدر رنگ جلوؤں سے حقیقت کے  
جمال و حسن کرو و جذب اسکے رومے روشن میں  
بناد و قاش اک مہتاب کی لب ہائے رعنا کو  
بسا کر مستیاں آنکھوں میں جان میکدہ کردو  
فروغ ماہ سے لیکر اُجالے دو جلا اس کو  
جہیں کو اس کی آئینہ بناد و نورِ ہستی کا  
کرد تعمیر اسکی یون، کہ مشکل ہو جواب اس کا  
حیا کی گویوں سے روح تک اسکی لچک جائے

غرض یہ نقش ہو گا ایک نقشِ یادگار اپنا

اسے دنیا میں بھیجیں گے بنا کر شاہکار اپنا

فرشتوں نے مناجرت سے یہ اعلانِ فطرت کا  
کرن اک عرش سے لیکر چین سے مستیاں لیکر  
خطوطِ چہرہ زیبا کو ڈھالا جا ذہبت میں  
مزمین کر کے اجزائے سرور و نور سے اسکو  
خمیر آب و گل میں بھر دیا ہر رنگِ جنت کا  
بنایا اک ہیولا اور کیف افر و زرنگیں تر  
ہزاروں حسن پیدا ہو گئے صنائع کی صنعت میں  
نمایاں کر دیا کچھ اور خلد و حور سے اسکو

انٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی اک موجِ نکہت کی  
اسی نکہت کے سائے میں ہوئی تخلیق "عورت" کی

نبی احمد بریلوی



## زاہد فریب کار

اندھیری رات اور سرد بزمِ ناؤ نوش ہے  
فضائے کائنات کو سیاہیوں نے بھر دیا  
جبیں سجدہ ایک زاہد فریب کار ہے  
وہی جو دن کو خون چوستا ہے کائنات کا  
وہی کہ جس کا آستانہ سجدہ گاہِ خلق ہے  
وہی عبادتیں ہیں جسکی سیم و زر کے واسطے  
شریکِ ربِّ ذوالمنن، مقلدِ فرعون  
عبائے راہبانہ کس قدر نظر فریب ہے  
عیانِ جبیں سے انکسار و عبادت کی شان ہو  
دماغِ کبرِ اتقاؤ زہد سے پٹا ہوا  
زباں پر رٹ لگی ہے یا رحیم یا کریم کی

فسونِ خواب سے جہاں کی انجمنِ خموش ہے  
زمین و آسمان کو تیرگی نے ایک کر دیا  
نگاہِ حق شناس میں جو ننگِ روزگار ہے  
بزعمِ خود جو راہبر ہے جادۂ حیات کا  
وہی کہ جس کی ذات باعثِ گناہِ خلق ہے  
بھرا ہے جس نے روپِ لقمہ ہائے ترکے واسطے  
مرکبِ غرور و جہل، گمراہی کا آئینہ  
گھنی دراز ریش اسکی سرسبز فریب ہے  
مگر عمل کی پوچھے تو شیطنیت کی جان ہے  
غبارِ معصیت سے دل کا آئینہ اٹا ہوا  
مگر نظر ہے بکیسوں کے مال پر لٹیم کی

خدا ہی ایسی ہستیوں سے دہر کو پناہ دے  
یہ لا علاج عارضہ ہیں کائنات کے لئے

انجم رضوانی

## نقش و نگار

مجالِ دید کس کو ہو گی ان کے رمے روشن کی  
خدا جانے تیرے آوارہ اُلفت پہ کیا گزری  
یہ فصل گل نے کیا تعلیم دی ہو دستِ وحشت کو  
بیابانِ محبت میں جنوں ہے خضرِ میرا

حریمِ ناز کو تکلیفِ ناحق دی ہے چلمن کی  
کہیں سے آرہی ہے کان میں آوازِ شیون کی  
گرمیاں کی وہی حالت ہے جو حالتِ ہوا میں کی  
نہیں دیوانہ میں جو بات مانوں عقلِ رہزن کی

نگار اک دن مجھے مل جائیگا درجہ شہادت کا  
کسی کی تیغ سے وابستہ ہے تقدیرِ گردن کی

نگار